علی عباس حسینی

ہمارا گاؤں

اور

دوسرے افسانے

HaSnain Sialvi

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

HaSnain Sialvi

ناشر:

اورینٹل پبلشنگ ہاؤس ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

ملنے کا پتہ:

انوار بک ڈپو امین آباد لکھنؤ

پاکستان میں ملنے کا پتہ:

مبارک بک ڈپو بندر روڈ مقابل ڈینسو ہال
کراچی ۲

مطبوعہ:

سرفراز پریس لکھنؤ

سنہ ۱۹۵۶ء

قیمت ۳ سے

مصنّف کی دوسری تصانیف

الف:۔ افسانے

(۱) رفیق تنہائی۔
(۲) آئی، سی، ایس۔
(۳) باسی پھول۔
(۴) میلا گھومنی۔
(۵) کچھ ہنسی نہیں ہے۔
(۶) اُلجھے دھاگے۔
(۷) بیوقوف
(۸) گائے اماں (ہندی)

HaSnain Sialvi

HaSnain Sialvi

ب: ناول

(۹) سرسید احمد پاشا۔
(۱۰) شاید کہ بہار آئی۔
(۱۱) حکیم باتا۔ (مزاحیہ) ناول
(۱۲) کومل نگری۔ (ہندی)

ج: ڈراما

(۱۳) نورتن۔

د: تنقید

(۱۴) ناول کی تاریخ و تنقید

ملنے کا پتہ

اورئینٹل پبلشنگ ہاؤس ۲۳/۷ امین آباد لکھنؤ

HaSnain Sialvi

فہرست

۱	ہمارا گاؤں	سنہ ۱۹۴۹ء	۹
۲	گاؤں کی لاج	سنہ ۱۹۵۴ء	۵۷
۳	لاٹھی پوجا	سنہ ۱۹۵۵ء	۷۳
۴	چناؤ	سنہ ۱۹۵۶ء	۹۳
۵	بے وقوف	سنہ ۱۹۵۷ء	۱۰۳
۶	نور و نار	سنہ ۱۹۵۰ء	۱۲۳
۷	دودھ دا	سنہ ۱۹۵۲ء	۱۴۷
۸	حاجی بابا	سنہ ۱۹۵۴ء	۱۶۳
۹	پوتر سیندور	سنہ ۱۹۵۱ء	۱۹۱
۱۰	جل پری	سنہ ۱۹۵۳ء	۲۰۳

HaSnain Sialvi

HaSnain Sialvi

اپنا بیان

جو دس افسانے اس مجموعہ میں شامل کیے گئے ہیں وہ سب ہماری دیہاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ وہ حقیقت بھی ہیں، خواب بھی اور وہم بھی۔ لیکن ہمارا دیہاتی معاشرہ انھیں تانوں بانوں سے بنا ہے۔

یہ سارے افسانے "آجکل" دہلی، "نیا دور" لکھنؤ، "ملاپ" دہلی، اور "نقوش" لاہور میں شایع ہو چکے ہیں۔ میں ان کے مدیروں کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے اپنے جریدوں میں انھیں جگہ دی، اور ان تمام احباب کا بھی جنھوں نے ان کے مطالعے کی عزت بخشی۔

یہ افسانے کس معیار کے ہیں اور ان سے اپنے دیہاتوں کے سمجھنے میں کتنی مدد مل سکتی ہے، اس کا فیصلہ میرے ذمے نہیں۔ میں نے تو ایک مصور کی طرح جو کچھ دیکھا اس کی مرقع کشی کر دی۔ ہاں کبھی کبھی دکھتی رگوں پر بھی انگلیاں

HaSnain Sialvi

رکھ دی ہیں اور کہیں کہیں مداوا کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، لیکن میں آرٹ کو پروپیگنڈا بنانے کا قائل نہیں اور نہ فسانہ نگار کی جگہ سیاسی لیڈر بننے کا خواہشمند۔ میں تو اس طرح کے انسان بنانا چاہتا ہوں جو "بیوقوف" والے ناصر اموں سے یا نورونا روالی ذکیہ! قدامت پرستی و ترقی پسندی کے تصادم اور شور میں اکثر انسانیت کی شیریں آواز دب جاتی ہے۔ میں اسی کے گن گانا چاہتا ہوں، خواہ کوئی مانے یا نہ مانے، خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے!

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور!

بمبئی یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء
علی عبّاس حسینی

ہمارا گاؤں

۱۹۴۹ء

گاؤں کے عناصر ترکیبی میں تین "گ" شریک ہیں۔ گوبر، گرد اور گلی۔ گاؤں کی ہر فرد کے پاس مویشی کا ہونا ضروری ہے۔ بیل، گائے، بھینس، بکری۔ جو کاشت کار ہیں اُن کے پاس بیلوں کی جوڑی ہوگی۔ جو دولت مند ہیں وہ گائیں، بھینسیں ضرور پالیں گے۔ اور جس کے پاس کچھ نہیں ہوگا وہ بکری کے ہی ذریعے سے اپنے غم میں اضافہ کرے گا! غرض چھوٹا ہو یا بڑا، ہر مکان کی دیوار پر آپ گیلے اُپلے چپکے ہوئے پائیں گے، اور ہر گھر میں داخلے کے بعد جو پہلی صورت آپ کو دکھائی دے گی وہ گوبر کی ہوگی، بیضاوی، مخروطی، چپٹی، نوکیلی، سوکھی، گیلی، ادھ جلی، دھوئیں سے ایک نیا آسمان اور صحن میں پانی کے ساتھ ساتھ پھیل کر ایک نئی زمین بناتی ہوئی عمدہ کھاد کا یہ اسراف ہندوستانی دیہات کا خاص مارکہ ہے!

گرد بھی کچھ اسی افراط سے نظر آئے گی۔ کھیتوں میں جائے تو گرد۔ گھروں میں بیٹھے تو گرد، اور گلیوں میں گھومے تو گرد۔ گرد کا ایک گرداب ہوگا جس میں آپ غوطے لگائیں گے۔ گھٹیں گے، تڑپ تڑپ کر اُبھریں گے، سانسیں لیں گے اور ڈوب جائیں گے۔ اور حضرت عیسیٰ کا ارشاد یاد کر کے خاک بسر ہو جائیں گے کہ "خاک ہی سے ہم نکلے ہیں اور خاک ہی میں ہمیں پلٹ کے جانا ہے!"

——— اور گلیاں، الٰہی توبہ اُن سے بمشکل دو آدمی برابر سے گزر سکیں گے۔
اتنے ہی میں صاحب خانہ کی "کھاٹ" بھی بچھی ہو گی، اتنے ہی میں ننگے ننگے "لونڈے لونڈیاں" مٹی کے گولے بناتے اور ایک دوسرے کو "موتی چور کے لڈو لو" کہہ کہہ کر مارتے ہوں گے۔ اور اتنی ہی سی جگہ میں مرکھنی گائیں بھی بندھی ہوں گی! "کاشی کی گلیاں" دنیا بھر میں مشہور ہیں، لیکن وہی گلیوں کے سامنے اُن کی گندگی بھی پانی بھرتی ہے۔ وہ ہموار ہیں یہ ناہموار، وہ پختہ ہیں، یہ کچی، اُن میں ایک بار ضرور جھاڑو دی جاتی ہے، یہ ازل سے ابد تک کوڑا خانہ بنی رہتی ہیں!

ایسا ہی ایک گاؤں شیخن پورا ہے۔ شہر سے دس میل دور، پختہ سڑک سے تین میل کے فاصلہ پر۔ اگر آپ کہیں باہر سے آ رہے ہیں۔ اور زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ کو پہلے ہی سے آمد کی اطلاع بھیجنا چاہیئے۔ گھر والے ڈولی یا گھوڑی کا انتظام کر دیں گے۔ اور بے گار کے طور پر دو چار چمار بھیج دیں گے جب جا کر آپ لدے پھندے شیخن پور پہنچیں گے۔ ورنہ شامتِ اعمال سے بے اطلاع آئے تو سڑک تک یکہ لے آئے، پھر وہاں سے خود ہی قلی بنئے۔ جوتا موزہ اُتار دیجے، پائنچے گھٹنوں تک چڑھا لیجئے اور ایک حاجی کی طرح ننگے پاؤں سفر کیجئے۔ یعنی کئی کاواک نالوں سے اُتریئے۔ کئی پُل صراط مینڈھوں پر چلیئے۔ کئی کیچڑ سے بھرے کھیتوں کی بادیہ پیمائی فرمایئے، جب آپ ایک ٹیلا نما بلندی پر پہنچیں گے جس کے چاروں طرف آم، املی، کھجور، تاڑ، برگد، ببول کے درخت ہیں۔ اس نخلستان میں کچھ کھپریل سے چھائے ہوئے گھر ہیں، کچھ پھوس سے ڈھکے ہوئے جھونپڑے ——— یہ ہے شیخن پورا!

بستی ہے شیوخ کی، رہتے ہیں اس میں زیادہ تر چمار۔ عادات و اطوار نے نسلی و نسبی فرق کی دیواریں گرا کر پوری آبادی کو انسانیت یا حیوانیت کی ایک ہی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ بظاہر مکانوں میں فرق ہے۔ شیوخ کے مکان میں دو حصے ہوتے ہیں۔ مردانہ، زنانہ، مردانے میں ایک بڑا صحن، ایک پختہ کنواں، ایک چبوترہ، دو ایک دالان، دو ایک کمرے اور کوٹھریاں۔ زنانے میں چاروں طرف دیوار۔ دالان اور کمرے یا "کوٹھے" ہوتے ہیں۔ "یہ کوٹھے" شہر والے کوٹھے نہیں ہیں، جن پر بیٹھنے والیاں خاص نام و نمود حاصل کرتی ہیں۔ بلکہ یہ ایسے کمرے ہوتے ہیں جن کے طول و عرض میں صرف ایک دروازہ ہوتا ہے اور نہ کھڑکیاں، نہ دریچے، نہ روشن دان، نہ موکھے، نہ ہوا کا گزر نہ روشنی کا ڈربا —— اگر صاحب مکان کشادہ خاندان ہوا تو گھر میں ایک "خلوت" بھی ضرور ہوگی۔ جو بہو یا داماد کا مسکن ہوگی۔ اس خلوت میں ایک چھوٹا سا صحن، ایک چھوٹا سا دالان، ایک چھوٹا سا کوٹھا، ہوگا، اسی میں ایک پاخانہ اور ایک حمام کا اضافہ کر کے اسے بڑے شہروں کے "فلیٹ" کی طرح مکمل مکان بنا دیتے ہیں۔ شیوخ کے تمام مکانات کی دیواریں کچی ہوتی ہیں اگر کسی نے بڑی ہمت کی۔ تو بنیادیں پختہ کرا دیں۔ ورنہ عام اصول سے ہٹنا آبائی طریقے کے خلاف ہے۔ یہ مکانات عموماً نیم کی دھنیوں اور ٹیڑھے بانس رکھ کر کھپریل سے چھائے ہوتے ہیں۔ دیواروں پر چونے کی کم، زیادہ تر گوبر اور پنڈول کی قلعی ہوتی ہے۔ ان کے صدر پھاٹک بڑے ہوتے۔ بقیہ دروازے اس طرح ناپ کر بنائے جاتے ہیں کہ ہر آنے والے کو سر جھکانا ضرور پڑے۔ سر اٹھا کر چلنے والوں کو آم کی چوکھٹ ٹیپ لگائے بغیر گزرنے نہیں دیتی۔

شوخ کے محلّے سے ملا ہوا ایک کچّا تالاب ہے۔ برسات کے موسم میں اس کے گندے پانی میں نہا کر لوگ داد اور اکوتا مفت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور جاڑوں میں اس میں پلے ہوئے موٹے مچھّر گاؤں بھر کو ملیریا بغیر کسی اُجرت کے تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ امراض کے اس معدن کی دوسری جانب تخمی آموں کا ایک باغ ہے اور اس کی پشت پر چمار ٹولی۔

یہ پھونس کے جھونپڑوں کے چھوٹے چھوٹے گھروندے ان شُدروں کے ہیں جو آریہ قوم کی آمد سے پہلے اس دیش کے راجہ تھے۔ ان کا کام مختصر پیمانے پر کھیتی اور بڑے پیمانے پر بیگار ہے۔ شیخوں کی اس بستی میں اُن سے چھوت چھات نہیں برتی جاتی۔ چمار شیخ کے ہر کام میں شریک رہتا ہے، وہ ان کا ہل جوتتا ہے، وہی ان کی بھینسیں، گائیں کھولتا، باندھتا، کھلاتا، پلاتا ہے، وہی ان کے گھوڑوں کا سائیس ہوتا ہے، اور وہی ان کے گھڑوں میں پانی بھرتا ہے۔ چمارنیں زنانخانے میں کوٹتی پیستی، جھاڑو دیتی ہیں۔ اور شیخائنوں کے وہاں بچہ جنانے اور پیٹ گرانے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں۔ بچپن کے شیخ اور چماروں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں بالکل مطابق فطرت بنے ہوئے خاک میں لوٹتے اور گرد اُچھالتے ہیں۔ شیخ بچوں کا رنگ گندمی اور چمارزادوں کا رنگ کالا ہوتا ہے۔ ان کا نقشہ ایک حد تک ٹھیک اور اُن کا بڑی حد تک بھدّا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں نسلی آمیزش ہوتی ہے چمار بچہ رنگ اور نقشے میں کبھی بازی لے جاتا ہے۔ یہ خوردسال جب ذرا بڑے ہوتے ہیں۔ تو ایک ختنہ کرا کے کرتا پائجامہ پہن لیتا ہے، دوسرا قطع و برید کی پابندیوں سے آزاد ایک عرفی آگے پیچھے لپیٹ لیتا ہے۔ لیکن اتنے دنوں کے

ساتھ میں شیخ زادہ اپنے ساتھیوں سے تین چیزیں سیکھ لیتا ہے۔ ایک تو حقہ پینا' دوسرے ننگی ننگی گالیاں بکنا اور تیسرے بقائے نسل کا گُر یعنی عورت کا مصرف!

"چھوٹی اُمت" بچوں کو تفریحاً حقہ پلاتی ہے۔ تین برس کا بچہ جب دم لگاتا ہے تو بابا جان اسے ایک موٹی سی گالی دے کر فخریہ برادری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ زمیندار کا لڑکا بھی اگر ہاتھ کا چونگا بنا اور چلم اُنگلیوں میں لے کر کش لگائے تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اسے ایک ہُنر تو آگیا۔ اور "مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟" گالیاں روزمرہ میں داخل ہیں۔ بیٹے کو سالا کہہ کر پکارنا اور لڑکی کو سالی کے خطاب سے یاد کرنا رشتوں میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں پیدا کرتا۔ ایسے ناتے تو تفنن طبع کے لئے روز ہی ایجاد کئے جاتے ہیں۔ آخر ہمارے انگریزی اسکول اور کالجوں کے لڑکے بھی تو ایک دوسرے کی ماں بہنوں کے ساتھ زبانی مشق کرم فرماتے رہتے ہیں وہ تو غیر مہذب جماعتیں ہیں۔ نیچ ذات، تیسرے طبقے والے، بہائم صفت، انسانیت سے خالی آدمی!

اب رہا عورت و مرد کا تعلق، سُو جناب دنیا اسی پر قائم ہے۔ چار ٹولی میں بچپنے سے اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تھوڑے بیال میں ننگے والدین اور ننگے بچے سوتے ہیں۔ اور اس وجہ سے بزرگوں کے تمام حرکات سے واقف ہو جاتے ہیں۔ بچے نیم خوابی کی حالت میں بڑوں کی چھیڑ چھیل دیکھتے ہیں اور تحت الشعور کے گودام میں جنسی تجربات کا سرمایہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ پھر پانچ برس کی عمر ہوئی اور بیاہ رچا دیا گیا۔ بارہ تیرہ برس کے ہوئے اور "گونا" ہو گیا۔ میدانوں، جنگلوں میں جانوروں کے اشتغال دیکھے، گھروں کے اندر والدین کے افعال کا نظارہ کیا، نقل پر اُتر آئے

اور نقل کو مطابق اصل کر دکھایا۔

شیخ زادے کھیتوں میں جاتے، مدرسوں میں "ما عقیمان کوئے دلداریم" کا سبق لیتے اور بچپن کے ساتھیوں کی بغل میں "بسکی کلیاں" دیکھتے، بن بیاہی شیخانیاں پردے میں لپٹی رہتیں، بڑی بوڑھیوں کا کڑا پہرہ رہتا، ادھر تو قابو نہ چلتا، لیکن اندھیرے، اجالے پیٹ کی ماری، یا برتری کی خواہش مندیاں ہی جاتیں۔ بعض سے وقتی یا موسمی دل آویزیاں رہتیں اور بعض مستقل طور پر جھونپڑیوں سے کھپریلوں میں منتقل ہو آتیں۔

چونکہ یہ ارتباط بزرگوں کے زمانے سے چلا آتا ہے۔ اس لئے گاؤں میں ایک تیسرا طبقہ بھی پیدا ہوگیا ہے۔ یہ "خان" کہلاتے ہیں۔ یہ "خان صاحبان" نہ تو خان بہادر قسم کے جانور ہیں اور نہ پٹھان قسم کے سورما۔ نہ یہ حکومت آشنا نہ افسروں کے کاسہ لیس، نہ آفریدی، نہ یوسف زئی! ـــ یہ ہیں شیوخ کے پیدائشی غلام۔ جاگیردارانہ نظام کی ناگفتہ بہ "پیداوار"!۔ ان لوگوں نے بھی اس چھوٹی سی سوسائٹی میں اپنی خاص جگہ بنالی ہے۔ ان کی آپ اپنی برادری ہے، ان کے علیحدہ مکانات ہیں۔ اور ان کی باقاعدہ بیویاں ہیں، بچے ہیں، بچیاں ہیں۔ ان میں سے کچھ کلکتے جاکر "جیٹ کل" میں کماتے ہیں۔ اور وہاں سے پلٹتے پر "میاں" کے لئے کچا ناریل، کیلے اور کھجوریں سوغات کے طور پر ضرور لاتے ہیں۔ یہ تازہ ولایت اپنی "کلکتیا" تہمد باندھے "ہم بولا، ہم ہیٹر اجائے مانگتا" کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، گاؤں میں ذرا چہل پہل رہتی ہے۔ برادری میں ان کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ نوجوان شیوخ ان کے ہاں جاکر نئے نئے سٹ میں چائے پیتے اور ان کی بیڑیاں سوارت کرتے ہیں۔ اور جب وہ "جیٹ کل"

واپس چلے جاتے ہیں تو آپس میں اس چند روزہ تواضع پر اپنے اپنے خاص انداز میں اظہار افسوس کرتے ہیں۔

شعیب نے کہا "یار وہ گھیٹے ...... بھی چلا گیا۔ صبح شام کی چائے بھی گئی اور اچھی اچھی بیڑیاں بھی!" قیوم، جسے حد درجہ طبقاتی احساس تھا، معترض ہوا۔ "میاں شعیب ان چھوٹے آدمیوں سے تمہاری اتنی بے تکلفی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔"

رشید نے شعیب کا ساتھ دیا۔ "مگر مفت کی شراب تو قاضی کو بھی حلال ہوتی ہے!"

محمود نے، جو ان میں سب سے زیادہ شریر تھا، آنکھ مار کر کہا "ہاں جی، وہ بھی جب کہ شراب دو آتشہ ہو، میاں کی موجودگی میں مہکتی چائے اور لہکتی بیڑی اور میاں کی غیر حاضری میں ـــ ..." وہ ذرا رک کر کھانسا۔

شعیب کھسیانی ہنسی ہنسا "کیا بکتے ہو جی! آخر بڈھیا میرے گھر کی پروردہ ہے، دوسرے تیسرے اگر اس کی خیر صلاح کو چلا جاتا ہوں تو کون سی برائی کرتا ہوں؟"

محمود نے منہ سکھا کر کہا "ہاں جی گھر کی کھیتی ہے ......"

قیوم بولا "میں تو ان لوگوں کی شادی بیاہ کا قائل نہیں۔ خواہ مخواہ ان کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں۔"

رشید جھٹ بول اٹھا "یعنی شیوخ کا مال شیخ زادوں کے پاس رہے، کیوں؟"

محمود نے پھر چٹکی لی "اور شیخ زادے باندیوں کو اپنی محل میں جگہ دے کر انھیں پستی سے بچا لیں!" اور نوجوان قہقہوں سے فضا گونج اٹھی۔

قیوم کو احساس برتری اس لئے تھا کہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار اِسی کے گھرانے والے تھے۔ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا، صرف چچا زندہ تھے۔ ان کی ذات سے دنیا کے سات عجائب میں آٹھویں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ چار فٹ کا قد۔ دُبلے پتلے، سُنکھنی، کرنجی آنکھیں، بھورے بال، آواز مہین، ایسی جو انجن کی سیٹی سے سب سے پہلے پیدا ہوتی ہے۔ ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔ بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے۔ جیسے گئے پارچے کا جاپانی کھلونا۔ روایت ہے۔ کہ کسی زمانے میں ان کی شادی بھی ہوئی تھی، اور ان کی ایک بیوی بھی تھیں۔ نئی دلہن میکے سے خوش ہو کر آئی۔ لیکن جب سسرال سے پلٹی تو افسردہ و مضمحل۔ دو تین برس رسماً آنا جانا رہا، پھر جب حیا و شرم کی پابندیاں اُٹھ گئیں اور اس کی آواز میں وزن آگیا تو وہ میکے جا کر بیٹھ رہی۔ نہ چندو میاں اپنی سسرال گئے اور نہ اُس نے اپنا میکا چھوڑا۔ نہ اُسے روزے نماز سے فراغت ملی اور نہ انھیں مقدمہ بازی سے۔ لوگوں نے چہ می گوئیاں کیں، مگر چندو میاں کے "ترک" میں کوئی فرق نہ آیا۔ باندیوں نے بھی پھندے ڈالے مگر وہ ہوشیار مچھلی کی طرح ہر جال سے پھسل کر نکل گئے۔ یہ لوگ کہتے تھے بھوک ہی نہیں، چارہ کیونکر کھائے!

چندو میاں کا سارا زور مقدموں پر صرف ہوتا تھا۔ برادری والوں سے لڑتے تھے، گاؤں والوں سے لڑتے تھے، غیر گاؤں والوں سے لڑتے تھے، باوجہ لڑتے تھے، بے وجہ لڑتے تھے، ڈنک کر لڑتے تھے، خم ٹھونک کر لڑتے تھے، بہانے ڈھونڈ کر لڑتے تھے ہنس ہنس کر لڑتے تھے رو رو کر لڑتے تھے۔ مگر لڑے جاتے تھے! مقدمہ بازی ان کی زندگی تھی، اُن کی جان تھی، اُن کی رُوح تھی، اُن کا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا تھی! — صبح ہوئی اور وہ اپنی لنگی گھوڑی پر سوار، چلے کچہری — نہ جانے کب کھاتے

پیتے تھے۔ کب لیٹتے سوتے تھے۔ اور کب نہاتے دھوتے تھے۔ گاؤں میں شیوخ ان کے پاس بہت ہی کم اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ نہ اُن کے ہاں حُقّے سے کسی کی تواضع ہوتی تھی اور نہ تحفہ، درویش یا ن ہی کسی کو پیش کیا جاتا تھا اور نہ اُن سے گفتگو ہی میں کوئی لُطف آتا تھا۔ البتہ جب کوئی سیر پھرا اُن کی دیکھا دیکھی کچہریوں کی خاک چھاننے لگتا تو پھر اس سے بڑی دلچسپی اور دلچسپی لے کر باتیں کرتے تھے۔ مجسٹریٹوں کی کمزوریاں اور وکیلوں کی نااہلیاں وہ جُھوم جُھوم کر اپنے مخصوص روزمرّہ میں بیان کرتے تھے۔ اور پوچھنے والے کو بڑے گُر کی باتیں بتاتے تھے۔ جب تہوار میں کچہریاں بند ہو جاتیں تو چندو میاں بہت جز بز ہوتے تھے۔ "ایسی شوم تاریخوں" کے لیے کارندوں کو تاکید تھی کہ ایسا بندوبست رہے کہ رعایا پرجا اپنے مقدموں میں صلاح لینے ضرور آجایا کریں۔ ایسے میں چندو میاں اپنے پلنگ پر بیٹھی مار کرنے بیٹھتے تھے۔ ہر ایک کی روئیداد شروع سے آخر تک سنتے تھے۔ اُس سے ٹیڑھے ٹیڑھے جرحی سوالات کرتے تھے۔ اور بڑی دیر تک سوچ کر قانونی مشورہ دیتے تھے۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ بکرماجیت سنگھاسن پر براجمان ہیں یا حضرت سلیمان تخت فضا پر جلوہ افروز ہیں!

چندو میاں بس ایک معاملے سے حد درجہ چراغ پا ہوتے تھے۔ وہ تھا جنسی معاملہ۔ جہاں کسی نے شکایت کی کہ فلاں کی بیوہ فلاں مرد کے ساتھ رہنے لگی یا فلاں بھوکا آدمی برسوں سے باہر ہے پھر بھی اس کے پیٹ میں بچہ ہے، تو چندو میاں آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ وہ بے ساختہ اپنے پائجامے کی مُہریاں اُلٹ اُلٹ کر اپنی رانوں تک چڑھا لیتے، ننگی ران پر بار بار ہاتھ مارتے تھے۔ اور فریاد کرتے جاتے تھے "بارالٰہا! تو اپنا قہر کیوں نہیں نازل کرتا، اس گاؤں پر؟ ارے اب

یہاں ایسی ننگی باتیں ہونے لگی ہیں، جو کبھی نہ دیکھیں، نہ سُنیں! یقینی قیامت قریب ہے ایسے فواحش! ایسے گناہ کبیرہ!" ـــــ اور اگر کہیں بدقسمتی سے مجرم چندو میاں کا رِعایا نکلا، انھیں کی زمین پر بسا ہوا۔ تو بس اس کی شامت ہی آجاتی تھی۔ کارندوں کو فوری حکم ملتا تھا، "ابھی جاؤ! ابھی! اس پاجی کمینے کو میری زمین سے نکال دو!"

ظاہر ہے کہ اس نادری حکم کے بعد کس کی مجال تھی کہ وہ ردّ و قدح کرتا یا اُن سے پوچھتا کہ "جب اس کی برادری بیوہ کا قصور معاف کر سکتی ہے۔ یا جب بہو کی سسرال والوں کو بھات کھلانے کی خود ہی تمنا ہے تو آپ کو مفت کا قاضی بننے کا کیا حق ہے؟ پھر دیش نکالا دینے کا حق صرف حکومت کو ہے، آپ کسی گھر والے کو بے گھر اور کسی وطن والے کو جلاوطن کیونکر کر سکتے ہیں؟"

ایسے مواقع پر مخصوص طور پر ان کے ہم چشموں سے ان بن چشمک ضرور رہ جاتی تھی۔ جہاں چندو میاں نے کسی چمار کو جلاوطن کیا، کسی دوسرے زمیندار نے جھٹ اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ چند ہی دنوں میں تھوڑے ہی فاصلے پر کچی دیواروں کا ایک احاطہ کھنچ جاتا اور پھونس کا ایک جھونپڑا کھڑا ہو جاتا تھا۔ چندو میاں پیچ و تاب کھاتے غصے میں پھنکاریاں مارتے، ڈاڑھیاں نوچتے تھے، مگر موقع کی تاک میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح پناہ دینے والے زمیندار کو کسی جھوٹے سچے مقدمے میں پھنسائیں اور اسے کچہری کی خاک چھنوائیں۔

اس معاملے میں اُن کے سب سے بڑے حریف تھے اکّو میاں۔ ان کی جائداد کا بڑا حصہ ان کے باپ نے اپنے عنفوانِ شباب میں گنوا دیا تھا۔ اُن مرحوم کو ہر طرح

کی بازی کا شوق تھا۔ رنڈی بازی، چانڈو بازی، کبوتر بازی، بٹیر بازی اور نہ جانے کیا کیا بازی۔ جب وہ محفلِ رقص و سرود میں جاتے تو ان کا یہی اصرار ہوتا کہ طوائف انھیں کی طرف مخاطب ہو کر گائے اور انھیں کو دیکھ کر بھاؤ بتائے۔ اسی غرض سے وہ ہمیشہ صدر ہی میں بیٹھتے تھے، اور روپے ٹھیکری کی طرح رقاصہ کے آگے پھینکتے تھے۔ اور اگر کوئی اُن سے بھی زیادہ مسرف نکلتا تھا تو فساد کر بیٹھتے تھے۔ اُن کے ساتھ ہمیشہ دس بیس "لٹھ بند" رہتے تھے۔ ان کو خاصی لمبی تنخواہیں اسی روز کے لئے دی جاتی تھیں۔ ان کو دودھ، گھی اسی دن کے لئے کھلایا جاتا تھا۔ اس "یکہ تازی" کے نتیجے میں زمین بکتی تھی، گاؤں نکل جاتے تھے، مگر کسی سے مونچھ نیچی نہ ہوتی تھی!——
شیخن پچھا میں ان کی جائداد کا نصف حصہ چندو میاں نے خرید لیا تھا۔ اسی لئے وہ سب سے بڑے زمیندار بن گئے تھے۔ اور اِلّو میاں اُن کے سب سے بڑے حریف۔

اِلّو میاں نے باپ کی بہت سی خصلتیں ورثے میں پائی تھیں، مگر بازیوں کا انھیں شوق نہیں تھا۔ ایک تو ان کے پاس جائداد کے کم ہو جانے کی وجہ سے روپوں کی وہ پچھلی کثرت نہیں تھی، دوسرے اُن کی جنسی بھوک گاؤں ہی کی شوخ چشم مٹا دیا کرتی تھیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اُن میں گنہگاروں کو پناہ دینے کا جذبہ بھی تیز تھا۔ ایسے معاملات میں چندو میاں کا حکم جب وہ سنتے تو اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو خوب اینٹھ کر اُن میں نوک پیدا کرتے، پھر ایک خاص انداز سے ہنس کر کہتے۔

"ہاں بھئی، انگور کھٹے ہیں!"

اسی سے اُن سے اور چندو میاں سے خوب خوب مقدمہ بازی ہوتی تھی۔ کبھی وہ جیتتے تھے، کبھی یہ مگر نہ وہ اپنے غصے کو روکتے اور نہ یہ اپنی حرکت سے باز

آتے تھے۔ دونوں کو گاؤں کے نام کا بڑا خیال تھا۔

چندو میاں کہتے "میرے گاؤں میں کوئی زانی نہ رہے گا!"

اِنّو میاں کہتے "میرے گاؤں سے کوئی گنہگار نکالا نہیں جائے گا!"

چندو کہتے "اِنّو گاؤں میں شیطنت کے حامی ہیں!"

اِنّو کہتے "چندو میاں برہما کالی مائی اور یزداں کو اہرمن بناتے ہیں!"

ان دونوں سربرآوردہ شیوخ کے پیچھے اور پیچھے بہت سے شیوخچے اور زمیندارچے تھے۔ کچھ اس دربار سے وابستہ، کچھ اس سرکار سے متعلق۔ تھوڑی سی اُردو، تھوڑی سی فارسی، ہر ایک نے پڑھی تھی۔ بعض نے عربی کی بھی کچھ کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ دو ایک عالم بھی تھے۔ یہ مُلّا دُور دُور کے شہروں میں کسی مسجد یا مدرسے میں نوکر تھے اور زیادہ تر باہر ہی رہتے تھے۔ بس عید کے بعد دو چار دن یا محرم میں پانچ سات روز کے لئے گھر آتے تھے۔ ان کی بیویاں گاؤں ہی میں رہتی تھیں، اور مولوی صاحب کی ماہ بماہ بھیجی ہوئی تنخواہوں میں سے روپے بچا کر اپنی بن بیاہی بیٹیوں کے لئے چاندی سونے کے گہنے بنواتی یا شہر مبارکپور کے پھیری کرنے والے مومن بھائیوں سے مشروع اور اطلس کے تھان خرید کر سینت سینت کر رکھتی تھیں۔ جب برس ہا برس کی کوششوں اور خفیہ خط و کتابت کے بعد اُن کے رشتے طے ہو جاتے تو عقد کی تاریخ کے مہینوں پہلے گوشہ نشینی کی رسم کر کے یہ بچیاں "کوٹھوں" میں بند کر دی جاتی تھیں، جہاں صرف نائنیں جا کر اُن کے گورے پنڈوں پر اُبٹن لگاتی تھیں اور جہاں سے وہ صرف تاروں کی چھاؤں میں سب کی نظر بچا کر پیشاب پاخانے کے لئے باہر نکلتی

تھیں۔ مہینوں کی اس قید و بند کے بعد جب تاریخ معینہ آجاتی تو شادی کی خوشی میں نہ تو گھر کی عورتیں گانے پاتیں، نہ میراثنیں ڈھول بجا سکتی تھیں اور نہ گاؤں کے "حلال خور" اپنا "حق" لینے کے لئے دف لے کر مولوی کے پھاٹک پر آسکتے تھے اور نہ ان فاقہ کش مظلوم بے زبانوں کی رخصتی پر بابُل ہمک گانے کی اجازت ملتی تھی! مولوی سوکھی لکڑی ہوتا ہے اُس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا۔ اس میں رسموں کی چکماتی لگا کر لچک نہیں پیدا کی جاسکتی!۔

ان مولویوں کی آمد سے گاؤں کے سکون میں ہمیشہ ایک مد و جزر کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ مد کا اثر تو مسجد کی آبادی سے ظاہر ہوتا تھا اور جزر کا اثر تالاب کے اس پار والی بستی کے سناٹے سے۔ اکثر نوجوان ارتداد اور بے دینی کے الزام سے بچنے کے لئے "جبرا گاہوں" کی گشت چھوڑ دیتے تھے اور مُلّا کے پیچھے نماز ہی نہیں پڑھتے بلکہ لمبے لمبے اور خشک و بے ربط مواعظ شیر مادر کی طرح پی جاتے تھے۔ مُلّا کی گاؤں سے روانگی وہی سماں پیدا کر دیتی تھی جو رمضان کے بعد عید کے دن کے لئے مخصوص ہے۔ بچھڑے بغلگیر ہوتے تھے۔ بھوکے "خوان یغما" پر جھک پڑتے تھے اور سُونی سیجیں گرم و تیز نفس سے آباد ہو جاتی تھیں!

ان مُلّاؤں میں مولوی عبدالقدوس بڑے خصوصیات کے مالک تھے۔ پانچ فٹ چار انچ کا قد شریف تھا۔ مگر فربہی کی وجہ سے طول و عرض دونوں برابر۔ بالکل گول مول۔ جب چلتے تو معلوم ہوتا گھاس برابر کرنے والا رولر لڑھکتا چلا جا رہا ہے۔ ان کا سر اکثر و بیشتر منڈا رہتا تھا۔ فرماتے تھے "سر پر بال رکھنے سے اہل فرنگ سے تشبہ ہوتا ہے۔ کنگھا کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے اور مرد بھی، مانگ چوٹی میں گرفتار ہو جاتا

ہے"۔ اُن کے چہرے میں کئی چیزیں نمایاں تھیں۔ ایک تو بھوؤں کے درمیان ایک سیاہ گھٹا جو اُن کے "قائم اللیل" ہونے کی سند تھا۔ دوسرے آنکھوں کا اختصار۔ وہ بھی اتنی بھیگی بے رونق کہ دیکھتے ہی یقین آجاتا کہ مولانا نے نہ کبھی کوئی حسین چہرہ دیکھا تھا اور نہ دیکھ سکتے تھے۔ ناک بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ بینی کی جگہ بٹن معلوم ہوتی تھی۔ ناک کی اس تخفیف نے مونچھوں کے اُگنے کے لئے ایک اچھا خاصا وسیع میدان چھوڑ دیا تھا۔ وہ غریب بھی اپنے فرائض سے غافل نہ تھیں۔ لیکن ملّا جی سدا اُن کے پیچھے پڑے رہتے تھے اور ہمیشہ ان کے نخلِ آرزو کی جڑ کاٹ دیتے تھے۔ اُن کی ساری فیاضی، ساری دریا دلی۔ ساری سخاوت، ساری عنایت صرف ہوتی تھی ریشِ اقدس پر۔ اس کو ایسی شاداب زمین ملی تھی کہ ایک ایک بال میں بیس بیس بال نکلتے اور برگد کے جٹے کی طرح بڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ یہ گردہ دار دور از ریش ایک گول ڈھال کی طرح سینۂ صافی کی حفاظت ہی نہیں کرتی تھی بلکہ تنورِ شکم کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتی تھی۔ اسی خصوصیت نے غالباً انھیں ڈاڑھی کے بارے میں "متشدد" بنا دیا تھا۔ وہ جب کبھی گاؤں کے کسی نوجوان کو اس جال کے اُلجھانے سے اغماض کرتے دیکھتے تھے تو وہ اسے "زجر و توبیخ" کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ اس سلسلہ میں حدیثوں کی ترجمانی اور بال کی کھال نکالنا اُن کا خاص حصّہ تھا۔

نوجوان ان سے ڈرتے بھی تھے اور انھیں چھیڑتے بھی تھے۔ وہ جب کسی ساتھی کو ستانا چاہتے تو بڑی دیدہ دلیری سے اسی کے منہ پر اس کی طرف سے اس کا وکیل بن کر ملّا جی سے میلاد شریف پڑھنے کی فرمائش کر دیتے تھے۔

محمود ہاتھ جوڑ کر کہتا "قبلہ! شعیب نے ابھی حال ہی میں دیوانی سے مقدمہ جیتا ہے۔ اسی خوشی میں وہ میلاد کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس شرط پر کہ آپ ہی بیان فرمائیں۔"

مولانا کا گول چہرہ چمک اٹھتا تھا۔ مگر ازراہِ انکسار اتنا ضرور فرماتے تھے "میاں، میں تم لوگوں کے پسند کا میلاد نہیں پڑھ سکتا۔ مجھے آجکل کے لوگوں (اہل لوگوں" میں بڑی تحقیر ہوتی تھی) کی طرح گل و بلبل کے شاخسانے نہیں لگانے آتے۔ نہ مجھے ناولوں کی سی زبان پر قدرت ہے۔ میں تو سیدھے سادے الفاظ میں احکام شرع بیان کرتا ہوں اور بس۔"

شعیب پہلو بدلا کیا۔ اچھا پھنسایا اس پاجی محمود نے۔ یہ ملّا اب میلاد پڑھ کر ہی دم لے گا۔ لیکن کیسے کہے کہ "مولانا یہ سب محمود کی شرارت ہے۔ نہ میں میلاد کرنا چاہتا ہوں اور نہ مجھے آپ سے بیان کرانے پر اصرار ہے" وہ خاموش رہا۔ صرف مولانا کی آنکھیں بچا کر محمود کو غصّے سے گھورا کیا۔ وہ شریر ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

رشید نے ٹکڑا لگایا "حضور، جو لطف آپ کی بول چال میں ہے، جو دلکشی آپ کے سادے بیان میں ہے وہ دوسروں کی آورد و تصنع میں کہاں!"

ملا صاحب نے میلاد پڑھنا منظور کر لیا۔ وہ مسکرائے۔ ان کے پیلے پیلے دانت بے تحاشا باہر نکل آئے۔ ان دانتوں اور مسواک اور منجن سے بس اسی زمانے میں ملاقات ہوئی تھی۔ جب ملاجی کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور بیوی کو ان کے دہن مبارک کی خوشبو نہیں بھائی تھی۔ اس زمانے میں ملاجی نے داڑھی کے

ساتھ دانتوں کی طرف بھی توجہ کی تھی۔ مگر جیسے ہی بیوی بچہ کش بنیں اور انھیں اندھیرے اُجالے ملّا جی سے چونچ لڑانا ہی پڑی۔ ایسی مسادات سی ہو گئی اور یہ محنت کی زحمت سے چھوٹے۔ ان دانتوں کو بالکل مطابق فطرت چھوڑ دینے سے وہ بالکل ویسے ہی موٹے تازے تھے جتنی کہ گوبر سے لپی ہوئی دیواریں۔

محمود کے اس طرح وعدہ لے لینے کے بعد شعیب کو میلاد کرنا اور گاؤں کی رسم کے مطابق آس پاس کے قریوں میں اس کے انعقاد کی اطلاع بھیجنا ہی پڑی جب تاریخ و وقت مقررہ پر لوگ جمع ہو گئے تو ملّا صاحب کرسی پر تشریف لے گئے اور لہک لہک کر بیان فرمانے لگے۔ اس بیان کے سلسلے میں اس کی پابندی نہیں ہوتی تھی کہ وہ کسی خاص موضوع پر ہو یا اُسی آیت و حدیث سے دست و گریباں رہے جس سے وعظ کی ابتدا کی گئی تھی۔ وہ بالکل ایک داغے ہوئے سانڈ کی طرح دوا تیوں کے ہرے بھرے کھیتوں سے گزرتے اور جس کھیت میں جی چاہتا دو منہ مار کر جگالی کرتے آگے بڑھ جاتے تھے۔ اس دوران میں وہ جب کبھی جوش میں آجاتے تو اپنے ایک پائینچے میں اس انداز سے ہاتھ ڈال لیتے جیسے وہ کلوخ سے "طہارت" فرما رہے ہیں۔ اس "ہئیت کذائی" پر خواہ بوڑھے روئیں یا نوجوان اور بچے ہنسیں۔ مولانا وعظ کے ساتھ ساتھ اپنا کام جاری رکھتے تھے۔ کبھی کبھی جب جوش اپنی حدوں سے آگے نکل جاتا تھا تو مولانا دس دس منٹ تک آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ لیکن زبان برابر ایک پرانی مشین کی طرح شور و شغب مچاتی چلتی رہتی تھی۔ نوجوان ایسے ہی مواقع کی تاک میں رہتے تھے۔ جہاں مولانا کی آنکھیں پہلی بار بند ہوئیں اور انھوں نے میلاد میں تقسیم کیا جانے والا نقل یا بتاشا باہر سے

آنے والے سامعین کو بانٹنا شروع کر دیا۔ مولانا نے آنکھیں کھولیں اور سینی خالی ہوتی سے ڈھک دی گئی۔ مولانا نے دوبارہ آنکھیں بند فرمائیں۔ اور گاؤں والوں نے بھی حصے لئے اور گھر چلے۔ جب اس پر بھی چشم پوشی اور تقریر یک وقت جاری رہی تو بوڑھے بالے سب کھسکنے لگے۔ اور جب مولانا نے آخری بار مجمع پر نظر ڈالی تو صاحب خانہ اور اس کے اعزا، خاص کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اب مولانا کے پاس اس کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا کہ وہ اپنے ہم وطنوں پر لعنت بھیج کر وعظ کو ختم کر دیں۔۔۔ لیکن ایسے حادثوں کا خمیازہ گاؤں والوں کو کسی دن بھگتنا پڑتا تھا۔ مولانا ایک "بھنگ گھٹنا" لئے گاؤں کے باثر شیوخ کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور انھیں زنانخانے کے باہر کوئی جائے مفر نہ ملتی تھی۔ جب کسی ایک کی شامت آ جکتی تو آہستہ آہستہ اپنے اپنے بلوں میں سے سب نکلتے۔ اور مختلف طرح کے بہانے تراش کر دیوان میلاد سے اُٹھ جانے کی عذر خواہی کرتے۔

مولانا ہی سے ملتی جلتی طبیعت شیخن ماما کی تھی گلستاں بوستاں پڑھنے اور چہل سال سے زائد ہونے کے باوجود وہ "چار پایہ" بھی تھے اور طفل مزاج بھی۔ ان کو اپنی ہمہ دانی پر ناز تھا۔ وہ عامل بھی تھے۔ رمّال بھی۔ جفّار بھی تھے، ساحر بھی پہلوان بھی تھے، بنوٹیے بھی۔ ان کو یقین تھا کہ ان کی دعاؤں سے بہاریں آتی اور ان کی بد دعاؤں سے قیامتیں نازل ہوتی تھیں۔ حقیقت میں وہ بڑی طرح احساس کمتری کا شکار تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑ اُٹھتے اور لاٹھی ڈنڈے پر اتر آتے تھے۔ اگر کسی سے بس نہ چلا تو طرح طرح کی شکایتیں تھیں۔ فریادیں تھیں

شیون تھے۔ بین تھے۔ اس سلسلے میں وہ نئے نئے الفاظ خوب گھڑتے تھے اور روز مرّہ اور محاورے پر بڑی نوازشیں فرماتے تھے۔ انھیں جس چیز کا سب سے زیادہ غم تھا وہ یہ تھی کہ اُن کا سا سجیلا جوان بن بیاہا رہا اور برادری نے ان کی تکلیفوں پر نظر نہیں کی لیکن "شیخن اما بن بیاہا ہونے پر بھی نرمے" اچھوتے" نہیں رہے تھے۔ ان کی روایت پر اگر اعتبار کیا جائے تو ان کی عمر کے چالیس سال میں، جو خاصی لمبی چوڑی مدّت ہے وہ بھی دو چار رومانوں کے ہیرو بن چکے تھے۔ لیکن یہ معدودے چند واقعات ایک شیریں خواب بنکر رہ گئے تھے۔ وہ انھیں بدہضمی کے خوابوں کی طرح بھول بھی گئے ہوتے لیکن نوجوانوں کے مجمع میں اپنے ضبط و استقلال و نفس کشی کے مظاہرے کے طور پر وہ انھیں دوہرا دوہرا اور اُن میں نئے نئے حاشیے لگا لگا کر بڑبڑان کی تجدید کرتے رہتے تھے ان میں ایک دفعہ جسے حادثہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، جنسیات کے ماہرین کے لئے ایک قابل غور مسئلہ ہے۔

ان کا بیان تھا کہ کسی زمانے میں جب اُن کی ورزش چڑھی ہوئی تھی اور ان کا بدن "بنا ہوا" تھا اُنھیں ایک شادی شدہ خادمہ بہت پسند تھی۔ مگر جیسے ہی دو ایک دفعہ تنہائی میں اُدھر سے بھی اختلاط کا اظہار ہوا یہ بھڑک اُٹھے۔ یہ اُن کے جسم کو "بگاڑنے" کی ترکیبیں تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اس گلی سے گزرنا ترک کر دیا اور ریاضت میں قدرے اضافہ فرمایا۔ ایک دن سورا تفاق سے کشتی اور ورزش سے فراغت پاتے ہی شدّت کی پیاس لگی۔ اکھاڑے سے اسی کا گھر قریب تھا" بھولے سے وہیں چلے گئے۔ اندر پہنچے تو پانی بھی ملا پان بھی اور باتوں ہی باتوں میں اُن کا "کنوارپن" اُن سے بجبر چھین لیا گیا عجیب بات یہ ہوئی کہ دوسرے دن جب

پھر پیاسا پیاس بجھانے پہنچا تو ٹکا سا جواب ملا۔ "مجھے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ چیز کل پالی۔ اب اگر تمہیں حاجت ہے تو روپے لاؤ۔ ورنہ سوکھے سوکھے دال نہیں گلتی" غریب شیخن ماما کے پاس باتوں کے سوا روپیہ کہاں؟ اگر وہی ہوتا تو خادمہ کی جگہ بیوی نہ لاتے۔ سو وہ قسم کھاتے تھے کہ اس شب کے بعد پھر ویسی ملاقات نصیب نہیں ہوئی۔ — — — — — — — — — — — — — — —

— — — — — — — — — — — — — — — — — —

— — — غرض شیخن ماما باوجود اس طرح کے اضطراری حادثات کے برابر کنوارے ہی رہے۔ پھر بھی اُن پر اُس ایک واقعے کا نفسیاتی اثر بالکل ویسا ہی ہوا جیسا کہ یورپ کی اوسط طبقے کی عورتوں پر جبر کے مشتہر ہو جانے کے بعد ہوتا ہے۔ وہ اپنا سر غرور سے اونچا کر کے چلتے تھے کہ انھیں حسن و عشق کی سب سے بڑی سند مل گئی۔ بظاہر ہے کہ اس طرح کی شخصیت سے لطف نہ لینا گناہ تھا۔ گاؤں کے نوجوان اسی لئے انھیں دیکھتے ہی پروانہ وار گھیر لیتے تھے اور اُن میں سے ہر ایک اُن سے مزاح کر کے دو چار گالیاں سننے کی سعادت حاصل کر لیتا یا دو چار ٹیپیں کھا کر "خورد قصور" کا سزاوار بن جاتا تھا۔

شیخن ماما کے دوسرے اخوان اُن کی طرح نہ تو "اچھوتے تھے" نہ کنوارے، نہ لنگوٹ بند، نہ ریاضت کش۔ بلکہ بعض کے ہاں تو جنس کا عنصر اس طرح غالب تھا کہ معلوم ہوتا تھا اسید ہے عرب سے شہد و خرما کھاتے چلے آرہے ہیں۔ اور ایک ہے زائد بیوی کی اجازت انہیں کی خاطر عطا کی گئی ہے۔

HaSnain Sialvi

ان میں سے ایک صاحب "چھٹّن میاں" تو بالکل میرِ شکار کی حیثیت رکھتے تھے
خیریت یہ تھی کہ انھیں پرجا میں صرف چمارنیں پسند تھیں اور وہ بھی بوڑھی اور بیوہ
ــــــ کہتے ہیں عنفوانِ شباب میں ان صاحب کی ایک ہم قوم بیوی بھی تھیں۔ لیکن
سسرال میں اُن کو قیام کرنا کم ہی نصیب ہوا۔ میاں کا گھر صرف ایک دالان اور ایک
کوٹھری پر مشتمل تھا۔ چہار دیواری زمیں بوس ہو چکی تھی اور پردہ کسی طرح ممکن نہیں
تھا۔ لہٰذا وہ میکے ہی میں مر کے دفن ہو گئیں۔ اور شیخ جی نے اپنے خاص رجحان کا
اظہار شروع فرمایا۔ مختلف طرح کے ایسے رومانوں کے بعد، جن کی وجہ سے دیہاتی
زندگی کی خواب آور فضا میں کافی ہیجان پیدا ہوا۔ چھٹّن میاں ایک فوجداری کے
سلسلے میں سرکاری مہمان خانے بھی ہو آئے۔ اب تو واقعی ہوا سانڈ تھے۔ نہ پٹنے
جانے کی پروا، نہ ڈانٹے جانے کا ڈر، نہ برادری و اعزا کا پاس و لحاظ۔

سب سے پہلے انھوں نے ایک ساٹھ سال کی بڑھیا کو قاعدے سے گھر میں
لا کر ڈال لیا۔ ایک زمانے تک اپنوں سے منہ چھپاتے، زنان خانے میں "جوتہ کاری"
کرتے اور "چمار ٹولی" میں لٹھ لئے گھومتے رہے۔ وہ تین سال کے بعد جب یہ بات پرانی
ہو چلی اور گاؤں کی زندگی کا گندا پانی تہ میں بیٹھ چلا، تو دفعتاً دوسری بیوہ پر نظرِ انتخاب
پڑی۔ یہ نوجوانی ہی میں ایک "خان" کے ہاں "بیٹھ گئی تھی" اور اب چھ لڑکوں کی
ماں تھی۔ اسے شیخانیوں سے کہیں زیادہ "غوطہ و طہارت" کا لحاظ تھا۔ اور اپنے
ہم قوموں کو "چمار" اس تحقیر آمیز لہجے میں پکارتی تھی جیسے وہ منو کے زمانے کی خریدی
برہمنی تھی۔ شاید لہجے میں تلخی کی زیادتی کا سبب یہ بھی رہا ہو کہ باوجود تمام تصنعات
کے وہ اپنی نسل کو نہ چھپا سکتی تھی۔ کالی کلوٹی، دُبلی پتلی، پھینا نقشہ، بڑے

HaSnain Sialvi

ٹمٹے دانت، غرض وہ ایسی تھی جس سے ہر "انسان" بھاگتا۔ مگر چھنّا میاں کا مذاق تو سب سے جُداگانہ تھا، وہ اسے لے کر بھاگ گئے۔ پورا چھٹ کا میلا اس کی معیت میں دیکھا اور جیب پلٹے تو معلوم ہوا کہ اس کی ساری پونجی پوری کھانے میں ماٹھا دی اور چاندی کے گہنے جوا کھیلنے میں ہار ڈالے۔ البتہ اپنی بیوفائی کی یاد میں ایک بچے نے اس کا پیٹ بھر دیا۔ کچھ دنوں اس معاملے کا شور و شغب رہا پھر سکون ہو گیا، ہل چلنے کھیت گوڑے جانے، مکئی، جوار، چنا، گیہوں بونے کاٹے جانے لگے تھے اور ایکھ پیلی جانے لگی تھی کہ ایک شام کو ادھر کے کھیت سے ایک شور سا اُٹھا کچھ لوگ دوڑ پڑے تو ایک عورت کو سسکتے بلکتے جوار ٹولی کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اور چھنّا میاں خراماں خراماں۔ شخن پورا کی طرف پلٹتے نظر آئے ایک صاحب نے جسارت کر کے ماجرا پوچھا تو معلوم ہوا ایک نئی بیوہ نے گستاخی سے جواب دیا۔ اس لئے تادیب کی ضرورت پیش آئی۔ سائل ان کے چال چلن سے واقف تھا۔ اور ان کے ہاتھ میں اس مضبوط ڈنڈے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ جو ابھی کام میں لایا جا چکا تھا۔ اس لئے اس نے خاموشی ہی میں مفر دیکھی۔ مگر اس واقعے کے ایک ہفتے کے اندر ہی یہ خبر ملی کہ "ڈنڈہ زدہ" بیوہ خود بخود جھونپڑی چھوڑ کر آرام محل میں چلی آئی اور اندرون حویلی نئی اور پرانی میں جنگ زرگری جاری ہو گئی۔

پھر اک غوغا اُٹھا۔ جوان بیٹوں کے مادرِ گرامی کی اس حرکت پر احتجاجی جلسے کئے۔ زمینداروں کے پاس وفود بھیجے۔ مگر جب بوڑھی ماں اپنی رضا و رغبت کا کُھلے بندوں اقرار کرے تو کوئی کیا کر سکتا تھا۔ غرض پھر طوفان تھم گیا۔ لوگ اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے۔ اور گاؤں کی زندگی پھر تیلی کے کولھو کی طرح گھُر گھُر چلنے

لگی۔

جنسیات کا یہ ہیجان ہر طرف نہیں تھا۔ نوجوان شیوخ میں سے اکثر جو شہروں کی ہوا کھا آئے تھے اس طرح کے افعال کو بُری نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ چھٹنا میاں کی حرکتوں کو اس لئے اور بھی مذموم سمجھتے تھے کہ اس سے رعایا یا پرجا کا گندا خون ان کے پاکیزہ خون میں ملتا جاتا۔ اور اس سے آپس کا فرق بھی آہستہ آہستہ مٹتا جاتا تھا۔ وہ ان "نیچ قوم" والوں کو اس طرح اپنانے کو طیار نہ تھے وہ سیاست پر اعتقاد رکھتے تھے، وہ رعایا اور حاکم کی درمیانی خلیج پر کسی پُل بنانے کے قائل نہیں تھے۔ اُن کا مذہب ایک سا نہیں، اور تنگ ذہن تھا!

"تالاب کے اُس پار والی بستی ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ چھوٹے کچے چھپروں سے ڈھکے ہوئے ایک دو کے مکانوں کے سامنے ایک "مریل" بیل بندھا ہوگا، دو ایک کالے ننگے لونڈے دھول میں لوٹتے ہوں گے۔ اور تین چار گندے سُور "فوں فوں" کرکے صبح کا ناشتہ کھاتے ہوں گے۔ مکانوں کے اندر ایک طرف تھوڑا سا بھوسا رکھا ہوگا، دوسری جانب ایک بوسیدہ کھٹ، بیچ میں رسوئی گھر ہوگا۔ کئی مٹی کی ہانڈیاں، ایک پھول کی تھالی اور ایک لوٹا۔ دو ایک مٹکوں میں مٹر چنا رکھا ہوگا۔ ان میں سے ایک میں وہ کرتا "بیچ" کیا ہوا رکھا ہوگا جو میاں شادی بیاہ میں پہن لیتا ہے اور وہ سُرخ چادر بھی رکھی ہوگی جس میں لپٹی ہوئی چھنارن میکے سے آئی تھی۔ ایک الگنی پر دو ایک پھٹی پرانی ساڑھیاں پڑی جھول رہی ہوں گی۔ اور ایک یا دو زمینداری کی عطا کردہ قمیضیں نہیں، یہی ان کا اثاثہ ہوتا ہے اور یہی سارا سامان!

اساڑھ کا تک میں وہ ایک بیگھہ کھیت چمار جوت لیتا ہے، ورنہ زیادہ تر اس کا کام ہے۔ زمیندار کی بے گار اور ہر کاشت کار کی خدمت ـــــ چمارنیں بھی زمینداروں ہی کے گھروں میں لگی رہتی ہیں۔ اور بچے، بچیاں بھی وہیں سے گرہ اور "چھبینا" پا جاتی ہیں۔ ان کی زندگی میں چہل پہل بس دو وقتوں میں ہوتی ہے۔ ایک تو اس وقت جبکہ بھائی برادری مل کر ایک پورا سؤر بھون کر کھانے کی ٹھہراتے ہیں۔ ایسا موقع زیادہ تر "بھوانی جی" کے نام ہی پر پیدا کیا جاتا ہے ایک موٹا تازہ سؤر پکڑا جاتا ہے، اُس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے مضبوط باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ کسی نوکیلے حربے سے کونچ کونچ کر مارا جاتا ہے گاؤں بھر اس سؤر کی دلدوز چیخ سے عاجز آ جاتا ہے، جب کہیں جا کر اس سخت جان کا دم نکلتا ہے۔ پھر تو شب بھر "چمار ٹولی" سے ناچ گانے کی آوازیں بھی آتی ہیں۔ اور تُو تُو میں میں کی بھی۔ ان شبوں میں نہ تو شیوخ اپنے مکانوں سے نکلتے ہیں، نہ خوانین، نہ راجپوت نہ برہمن مصلحتاً چوبیس گھنٹے کے لئے چماروں کی بادشاہی تسلیم کر لی جاتی ہے۔

دوسرا موقع جب پر اس بستی میں زندگی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں وہ ہوتا ہے جب گاؤں میں کسی کا مویشی مر جاتا ہے۔ پھر جس کی "ججمانی"[1] ہوگی۔ وہی اُسے اُٹھائے گا۔ عادت نہ ہونے پر بھی اس مُرے جانور کی بوٹیاں چمار اس صفائی سے کاٹ لیتے ہیں کہ قصاب بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اس دن بھی چمار ٹولی میں گوشت کے ساتھ تاڑی چلتی ہے، رات بھر شور وشغب رہتا ہے اور چمار بیگار کے بار سے بری رہتا ہے۔

ایسے مواقع خریف کاٹنے پر بھی آتے ہیں جب تک چمار کے گھر میں

---

[1] خاندانی حق۔

اناج رہتا ہے۔ وہ اینڈتا رہتا ہے۔ جہاں اناج ختم ہوا اور وہ بھیگی بلّی بن جاتا ہے۔ ہوشیار زمیندار اسی لئے چمار کو زیادہ کھیت نہیں دیتا اور بے وقوف چمار خود بھی تھوڑے ہی پر قانع رہتا ہے۔ جہاں اسے پیٹ بھر روٹی کھانے اور چار آنے تاڑی پینے کو مل گئے اسے بادشاہی مل گئی۔ وہ نہ کارندے کی سنتا ہے، نہ زمیندار کی۔ اس لئے، آریوں کی آمد کے زمانے سے اس وقت تک راج ودیا کا یہی مجرب نسخہ ہے کہ چمار بھوکا رہے پٹتا رہے، اور بے گار میں جُتا رہے!۔

"چمار ٹولی" سے تین فرلانگ پر "اہیر ٹولی" ہے اس کے متعلق یہی اب تک نہ طے پا سکا کہ یہ شیخن پور اکے مضافات میں ہے کہ ٹھاکر گنج کے۔ شیخن پور والے اس کی ملکیت کے الگ مدعی ہیں اور ٹھاکر گنج والے الگ نفع میں ہیں اہیر۔ وہ نہ ان کو زمیندار مانتے ہیں نہ اُن کو جب ٹھاکر گنج والوں نے لگان مانگا انھوں نے کہہ دیا شیخن پور والے لے گئے۔ جب شیخن پور والوں نے تقاضا کیا۔ انھوں نے کہہ دیا۔ ٹھاکروں نے دام دام وصول کر لئے عام طور سے دونوں گاؤں والے اُن سے ڈرتے ہیں۔ پاجیوں کے کون مُنہ لگے؟" شیو نے یہی کہہ کر ٹالتے ہیں۔ "اب کے گھر کے سوا نگ باہر ہیں نہیں تو ان..... کا اکڑنا بھلا دیتے!" ٹھاکر ان الفاظ سے دل کا بخار نکال ڈالتا ہے۔

اہیروں کا کام کھیتی کرنا تو محض نام کا ہے، اصل میں یہ گوالے ہیں۔ ان کا گندمی رنگ، ان کا لمبا قد ان کے مضبوط ہاتھ پاؤں اور ان کی لاٹھی دُور دُور مشہور ہے بچتے ہیں دودھ لیکن اس میں دودھ کم اور پانی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ سفید پانی پہلے روپے کا سولہ سیر ملتا تھا۔ اب جیسے فرض ہوتی ہے۔ آٹھ آنے سیر لیتا ہے۔

اور خوشامد کر کے ان کے گھر سے لے جاتا ہے۔ یہ کوکو جم کو گھی بنا کر بیچنے میں خصوصیت سے مہارت رکھتے ہیں۔ اور ان کا دہی کھٹاس میں املی سے بھی نمبر لے جاتا ہے۔

اہیروں کا سوتے جاگتے دشمن کے کھیت میں مویشی ہنکا کر اسے چرا لینا، اس کی شاداب کھیتی کو دو دو چار چار کیاری کاٹ کر اٹھا لے جانا اور اس کے کھلیانوں میں غلے کے انبار کو آگ لگا دینا خاص مشغلہ ہے ایسے نیک کاموں کے لئے "قائم اللیل" ہونا ضروری ہے۔ سو اہیروں کا اس ریاضت کی فہرست میں سب سے اول نمبر ہے۔ دن کو وہ گائے بھینسوں کے غول میدانوں میں ہنکا کر کسی بڑے درخت کی شاخ یا کسی موٹی جیڑ پر ٹیک لگا کر سو رہتے ہیں۔ رات کو وہ گیارہ بارہ بجے کھانا کھا کر تفریح کرتے نکلتے ہیں۔ اب اگر چاندنی ہوئی تو وہ پانچ چار کوس "برہا" گاتے، کھیت چراتے ٹہل آئے اور اگر اندھیری رات ہوئی تو پھر وہ دشمن کے کھیت سے دو تین "بوجھ" زیع یا خریف کاٹ لاتے یا دو ایک دولتمند گھروں میں ڈھیلے پھینک آئے۔ اب ذرا گھنٹے دو گھنٹے سستائے، پھر جب سارے ساتھی اکٹھا ہو گئے تو جہاں طے پایا اس کے گھر میں پھاندے، یا سیند لگائی اور اسے "موس" لیا۔ یہ چوری بھی زیادہ تر انتقاماً ہوتی ہے، ضرورتاً نہیں۔

صبح کو جب اہیرنیں اپلے کے ٹوکرے اپنے سروں پر رکھے نکلتی ہیں۔ تو ان کی صراحی دار گردنوں کے خم اور ان کی پتلی کمر کی لچک میں ایک خاص دلآویزی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اپنی "مٹیا" میں دودھ دینے اپنے ٹھاکر کے گھر آتی ہیں اور مسکرا کر پانی کو دودھ ثابت کر دیتی ہیں۔ تو اکثر شیخ زادے اور ٹھاکر زادے دل کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ ذرا برتر قسم کی جنسیں ہوتی ہیں، اس لئے ان کا سودا نہ

اتنا آسان ہوتا ہے نہ اتنا سستا۔ کھانے پینے کی طرف سے اطمینان عام طور پر عفت فروشی سے باز رکھتا ہے، یوں دل مل جانے کی اور بات ہے۔ سو اس میں نہ قوم کی شرط ہے، نہ ذات کی، نہ مذہب کی، نہ ملت کی!

اہیروں کے مکان چماروں سے کہیں بہتر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاں مکان مسکونہ سے الگ مویشیوں کے لئے چھپر ضرور ہوتا ہے۔ ان کے ہاں دودھ رکھنے، دہی جمانے، گھی نکالنے کا سامان ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کے ہاں کچھ نہ کچھ جڑاؤ بھی ہوتا ہے۔ وہ بالکل ننگے قلاش نہیں ہوتے۔ پھر جو "ہاتھ چالاک" ہیں ان کے ہاں طرح طرح کی چیزیں دبی چھپی پڑی رہتی ہیں۔ وہ انھیں "سینت سینت کر" رکھتے ہیں۔ بس کبھی کبھی شادی بیاہ میں اُن کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔

ثروت کے ساتھ ساتھ ان کی قوت کے مظاہرے کا وقت بھی یہی ہوتا ہے براتی جس طرح سونے کے کنٹھے گلوں اور سونے کی "مُرکیاں" کانوں میں پہنے آئیں گے اسی طرح وہ اپنی تیل پلائی پیتل کی جڑی ہوئی لاٹھیاں بھی ساتھ لائیں گی، اور مگدر کی وہ جوڑی بھی جو سب سے زیادہ وزنی ہو اور جس کا ہلانا ہر ایک کا کام نہ ہو۔ رات بھر "برہے" اور "لڑکی" میں مقابلہ ہوگا۔ گھرانی اور براتی ہر ایک اپنے گانے والوں کو "ہا! ہا!" کہہ کر تال دیں گے اور "باہ! باہ" کہہ کر اس کا دل بڑھائیں گے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ صرف ایک رات میں یہ قصہ تمام ہو سکے۔ اس لئے اس میں کسی کی جیت ہار بہت کم ہی ہوتی ہے لیکن صبح ہوتے ہی مختلف ورزشوں اور ناچ کا مقابلہ ہوتا ہے۔ پھر اگر اس میں گھر والے اہیر تھک کر بیٹھ رہے تو اہیرنیں

نکل پڑتی ہیں۔ دونوں طرف سے خوب خوب گالیاں چلتی ہیں اور۔ اور حرکات وسکنات سے، اشاروں اور بھاؤ سے ہر فقرے کی ترجمانی بھی ہوتی رہتی ہے۔

ایسے مواقع پر شیخ اور ٹھاکر سب اپنے اہیروں کے شریک رہتے ہیں اور گاؤں کی "لاج" رکھنے کے لئے وہ ان کی ساری پچھلی شرارتوں کو پس پشت ڈال کر قدمے، سخنے، درمے ہر طرح اُن کا ساتھ دیتے ہیں۔

شیخن یوراو الے اہیروں سے بہت گھبراتے ہیں۔ صرف چند و میاں اپنی مقدمہ بازی کی بدولت ان سے نگان وصول کر لیتے ہیں، اور انّو میاں اُن سے اس لئے عاجز نہیں ہیں کہ اہیروں میں سے گُرگے اُن کے خاص ملازم ہیں۔ بقیہ زمیندار اسی پر راضی ہیں کہ اہیر نگان نہ دیں لیکن "زمیندار آزادی" نہ کریں۔

ٹھاکروں کا یہ خیال نہیں۔ وہ اہیروں سے ہر طرح کی ٹکر لیتے ہیں۔ اس لئے ان سے بال میں کبھی مقدمہ لڑتا ہے، فوجداری میں کبھی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ ہر برسات میں لاٹھیاں چلتی ہیں، سر ٹوٹتے ہیں، جانیں جاتی ہیں۔ لیکن نہ اہیر اپنی شرارت سے باز آتا ہے اور نہ ٹھاکر اپنی تادیب سے۔

ٹھاکروں کا قول ہے "شُدر ذات، جوتہ لات" بُرکھے کہہ گئے ہیں۔

"اہیر بہیر بن بکرا، بُوت بہان کھائیں چار لکڑا!"

اہیروں کا دعویٰ ہے کہ "ہم ہندوستان کے سب سے بڑے دیوتا کرشن کی اولاد سے ہیں، ہم اصلی چھتری ہیں، ہم راج پتر ہیں۔ ہم ٹھاکروں سے اگر اچھے نہیں تو کسی طرح ہیٹے بھی نہیں، اس لئے ہم کیوں دبیں؟"

غرض دونوں قدیم ہیں اور ان کی عادتیں اور اُن کی آویزشیں قدیم تر

جھگڑا ہم کیوں کر چکائیں۔ جو نئے تعلیم یافتہ بھی ہیں اور نئے زمانے کے بھی!
اس کے لئے تو پھر سے چانک آئیں تو کام بنے!

ٹھاکر گنج والے اپنے کو چندر بنسی کہتے ہیں۔ آپ کو خیال ہوگا چاند کی اولاد سے ہیں تو گورے چٹے، ہلال کے سے نازک ہوں گے۔ لیکن یہاں "برعکس نہند نام زنگی کافور" کا مقولہ حرف بہ حرف صحیح اترتا ہے۔ ان ٹھاکروں میں سے ہر ایک آبنوس کا سا کالا ہے، اور دیو کا سا قوی ہیکل۔ کہاوت ہے "لنکا میں ہر ایک باون گز کا"، ٹھاکر گنج کے لئے کسی مبالغے کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کا ہر ٹھاکر سات فٹ کا ہوتا ہی ہے۔ ان میں سے اکثر بدیشی سرکار کے زمانے میں فوجوں میں بھرتی ہو کر ٹھاکر گنج کا نام افریقہ و اطالیہ تک روشن کر آئے ہیں۔ لیکن بعض گھر ہی پر رہ کر ان سے کم نیک نام نہیں ہوئے۔ انھوں نے فوجداریاں کیں، خون کئے اور نینی جیل سے لے کر کالے پانی تک ٹھاکر گنج کی دھاک بٹھا آئے۔ ایسے لوگ اہیر ٹولی کو کیا خاطر میں لاتے ہیں جب کوئی اہیر لڑا یا وہ لاٹھیاں اور بندوقیں لے لے کر دوڑ پڑے اہیر بندوق کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس لئے دن میں پٹ جاتا ہے۔ لیکن رات میں وہ بدلہ مزدور لے لیتا ہے۔ وہ حریف ٹھاکر کے مویشی غائب کرا دیتا ہے۔ کھیت کٹوا دیتا ہے اور کھلیان میں آگ لگا دیتا ہے۔

ان جھگڑوں سے فائدے میں رہتے ہیں چندو میاں۔ بقول اُن کے دو موڈیوں کی کھٹ پٹ سے جھٹ پٹ فائدہ نہ اُٹھانا حماقت ہے" کبھی ٹھاکر

اپنے مقدموں میں ان کو گواہ بناتے ہیں، کبھی اہیر اپنی شرارتوں کے بعد اُن کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ چندو میاں ایسے اُلجھاوے سے بہت خوش ہوتے ہیں، اہیر پٹیں یا ٹھاکروں کا نقصان ہو۔ اُن کی بن آتی ہے۔ انھیں چھٹیوں میں بھی "جرح" کرنے اور "بحث" سُننے کا مشغلہ ہاتھ آجاتا ہے۔ پھر دونوں جگہوں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے کہ اُن سے زیادہ سمجھدار، اُن سے زیادہ با اثر اور اُن سے زیادہ قانون داں کوئی بھی نہیں! مُفت کا نام و نمود، جاگیردارانہ ذہنیت کے لئے آبِ حیات ہے!

ٹھاکر گنج میں اجیت سنگھ سب سے بڑے زمیندار تھے۔ مقدمہ بازی ان کا بھی مشغلہ تھا۔ انھیں لڑائی جھگڑے تُو تُو مَیں مَیں سے بڑی چِڑ تھی۔ تھے تو ٹھاکر لیکن مزاج پایا تھا شیخوں کا وہ کہتے "جب عدالتیں موجود ہیں تو ہم بے کار کے لئے ہاتھ پاؤں کیوں تڑوائیں؟ جھوٹ بولنا ہو وہیں چل کر بولو، بے ایمانی کرنا ہو وہیں چل کر کرو۔ کسی کی بیٹی بہو چھیننا ہو وہیں چل کر مجسٹریٹ کے حکم سے لے آؤ، آخر سرکار ان لوگوں کو اتنی بڑی بڑی تنخواہیں کیوں دیتی ہے! ان کے ہوتے تم بدنامی کیوں مول لو؟ وہ تو خود ہی قانون کے شکنجے میں لاکر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرتے رہتے ہیں!"

اسی لئے چندو میاں کی طرح وہ بھی صبح سویرے ہی کچھ کھا پی کر کچہری کے لئے روانہ ہو جاتے تھے۔ چندو میاں سے اُن سے اکثر راستے میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے مُشکی گھوڑے کو روک کر ان کی ٹٹّو گھوڑی کی چال چلانے لگتے تھے اور دونوں ایسا گھل مل کر باتیں کرتے تھے۔ جیسے تقریباً ہر معاملے مقدمے میں ایک

دوسرے کے حریف نہیں رہتے تھے ـــــ اسی لئے شرتا اہیر اور جھاندیدہ چمار اپنی اپنی پنچایت میں یہ ضرور کہتا "ارے سانپ کے بچے سانپ ہی ہوتے ہیں اجیت سنگھ اور چندو میاں دو نہیں ایک ہیں، دونوں زمیندار کے بیٹے! وہ ہم لوگوں کو آپس میں لڑا کر اپنے کو مضبوط کرتے ہیں۔ وہ ہمارا نہیں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ دعایا چاہے بھاڑ میں جائے۔ زمیندار کو اپنے حلوے، مانڈے سے مطلب اس لئے اپنے جھگڑے آپ ہی چکاؤ۔ ان سے صلاح مشورہ نہ لو!" ـــــ مگر ہوتا یہی تھا کہ بغیر ان دونوں کے سہارے کے کوئی کام نہیں بنتا تھا۔ اس لئے کہ نظام ہی غلط تھا، جاگیردارانہ نظام، مغلوں کا بنایا ہوا، انگریزوں کا قلعی کیا ہوا! بدیشی کی جگہ سودیشی کیسے بن جاتا؟

اجیت سنگھ کو خاص طور سے شوق تھا مینڈھوں کا۔ وہ دور دور جمنا پار، گنگا پار کے میلوں میں جاتے تھے تو مخصوص اسی کام کے لئے۔ سینکڑوں ہزاروں مینڈھوں کے دیکھ سینگ، آنکھیں، ناک، دانت پر نظر انتخاب ڈالتے تھے۔ بزرگوں کی لکھی ہوئی ایک کتاب میں دیکھ کر وہ اس کا ہر عضو ٹٹولتے تھے۔ اور جب وہ ہر طرح ان کے معیار پر پورا اُترتا۔ تو اُس کی قیمت طے کرنا شروع کرتے۔ کئی دن "مول بھاؤ" میں لگتے جب کہیں جاکر معاملہ حسب دلخواہ طے پاتا۔ میلے سے واپسی میں مینڈھے کی دیکھ بھال میں اتنی احتیاط برتی جاتی تھی، جتنی کہ ایک درجن شیر لانے کے لئے کافی ورشانی ہوتی اور مینڈھے کا ٹھاکر گنج میں داخلہ اس شان سے ہوتا تھا جیسے منٹگمری اوڈیس آبا میں داخل ہو رہا ہے ـــــ پانچ چار ٹھاکر آگے آگے لاٹھیاں لئے دو اہیر مینڈھے کی گردن میں رسیاں ڈالے دائیں بائیں، بیچ میں مینڈھا، کالے سینگ میں تیل چُپڑا ہوا، پیشانی پر سیندور کا ٹیکا لگا ہوا، گلے میں گھنگرو کا ہار پڑا ہوا،

چھم چھم کرتا۔ ڈگی دوڑتا ہوا سب سے پیچھے ٹھاکر صاحب مُشکی گھوڑے پر سوار، غرور سے آنکھیں چمکتی ہوئی۔ راستے میں اگر دور ہی سے کوئی دکھائی دیا، تو خود ہی گرج کر ڈانٹتے "ارے آنکھیں نہیں ہیں! ہٹ جا راستے سے، نہیں تو چوٹ چپیٹ آجائے گی!" ــــ گھر پہنچتے ہی مینڈھے کے لئے آدھ پاؤ گھی، دو سیر دودھ تین سیر چنا، بطور راشن کے مقرر کر دیا جاتا۔ اور جب تک کچہری نہ جاتے، سوتے، جاگتے نظروں کے سامنے وہ بندھا رہتا تھا۔ پھر دس بیس کوس تک چیلنج بھیج دیا جاتا تھا "جسے حوصلہ ہو وہ ٹھاکر اجیت سنگھ کے نئے مینڈھے سے مینڈھا لڑائے!" کوئی نہ کوئی شوقین مقابلے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ دو چار دفعہ طرفین کے آدمی آتے جاتے رہتے تھے کہ دفعات، دن، تاریخ، وقت، مقام، ساری باتیں طے پا جاتیں۔ پھر اس کا اشتہار چسپاں کر دیا جاتا اور ڈگڈگی پٹوا دی جاتی تھی۔ مینڈھوں کی لڑائی کے دن کا سماں قابل دید ہوتا تھا۔

صبح سویرے ٹھاکر صاحب کی گڑھی کے سامنے والا میدان ہموار کر دیا گیا لگو مہتر نے اپنے پورے قبیلے کے ساتھ شیخن پورا سے آکر اس میں جھاڑو دی۔ پھر اس پر چھڑکاؤ کیا گیا۔ اونچے اونچے پلنگ تماشا دیکھنے والے ٹھاکروں اور شیخوں کے لئے بچھا دیئے گئے۔ اور وقت مقررہ سے پہلے ہی آس پاس کے گاؤں کے لوگ جوق جوق آنا شروع ہو گئے۔ اگر ان میں شیخ، برہمن یا ٹھاکر ہوتا تو اس کی اہتمامی ضیافت ہوتی تھی۔ یعنی اسے شربت کا ایک جام دودھ ملا اور بالائی ڈال کر پیش کیا جاتا تھا۔ "نیچ اقوام" کے لئے گُڑ کے "رس" کی سبیل ہوتی تھی۔ جس کا جی چاہے پیئے۔ ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے پاس ہی موٹے موٹے اُپلے سلگتے ہوتے تھے، وہیں

آدھ سیر تمباکو اور متعدد چلمیں رکھی ہوتی تھیں۔ جس کا جی چاہے چلم بھرے اور ہاتھ کا چونگا بنا کر دم لگائے۔ اُن کی بغل میں بیڑی کے تین چار بنڈل، دیا سلائیوں کی کئی ڈبیاں اور ایک تھالی میں بہت سے بنے ہوئے پان رکھے ہوتے تھے۔ شیوخ کو خود اپنے ہاتھ سے پان اُٹھا کر دیتے تھے۔ ٹھاکروں میں سے جو ہاتھ بڑھائے "جام و مینا اسی کا ہے!" خود ڈلی پان سے رغبت نہیں تھی۔ صرف تمباکو کی پتی اور چونا بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں ملتے اور پھر اس کا گولا بنا کر نیچے کے ہونٹ اور دانت کے درمیان رکھ لیتے تھے۔ سُنہ کیسا زعفران زار بن جاتا اُس سے انھیں کوئی مطلب نہیں تھا اُن کے دانتوں کی "کلکا ہٹ" مٹ جاتی تھی۔

لڑنے والے مینڈھے طرح طرح سے تیار کئے جاتے تھے۔ اُن کے سر اور سینگ میں روغن بادام کھپایا اور ملا جاتا۔ ان کی ٹانگوں میں کڑوے تیل کی مالش ہوتی تھی وہ ہفتوں پہلے سے میوے اور مقویات کھلائے جاتے تھے۔ لڑنے کے دن اُنکی گردن میں کالا تاگا اور سینگ میں کوئی نہ کوئی تعویذ ضرور باندھا جاتا تھا۔ مالکوں کی ناک باقی رکھنا تھی کہ مذاق تھا!

وقت مقررہ پر دونوں مینڈھے مالکوں اور مربیوں کے حلقے میں دولھا مل جیسے سجائے آتے تھے۔ میدان میں پہنچتے ہی باری باری کر کے ٹھاکر صاحب کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ پھر دونوں طرف کے مشاق لڑانے والے اُنھیں لے کر آگے بڑھتے۔ تماشائی دو مستطیل قطاروں میں بٹ جاتے۔ اس گھرے ہوئے میدان کے بیچ میں دونوں پہلوانوں کو لا کر ایک دوسرے سے تعارف کرایا جاتا تھا جہاں انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر جھپٹنا اور سینگ لڑانا شروع کیا، ماہر

لڑانے والے انھیں گودوں میں اٹھا کر قطاروں کے بیچ ایک ایک کونے کی طرف لے بھاگے۔ وہاں جاکر انھیں زمین پر کھڑا کر کے ان کا رُخ ایک دوسرے کی طرف کر دیا۔ لیکن مینڈھوں کا پچھلا حصّہ اور دونوں اگلی ٹانگیں مضبوط پکڑے رہتے تھے۔ جیسے ہی حریفوں نے ایک دوسرے سے آنکھیں ملالیں اور ہاتھ پاؤں پھینک کر جنگ کے لئے بے چینی کا اظہار کیا "ہاں بیٹا! لینا بیٹا، لینا میرے شیر!" کہہ کر وہ چھوڑ دیئے گئے۔ دونوں تیر کی طرح سیدھے دوڑے اور بیچ میں آکر ٹکرّ ہوئی "تڑاق!" دونوں مینڈھے پیچھے ہٹے۔ لڑانے والوں نے دوڑ کر انھیں گود لیا اور پھر اپنے اپنے کونوں کی طرف لے بھاگے۔ پھر مینڈھوں کا ایک دوسرے کی جانب رُخ کیا گیا۔ پھر نعروں کے ساتھ چھوڑ دیئے گئے، پھر ٹکرّ ہوئی "تڑاق!" — ان ٹکروں کی تعداد مینڈھوں کے حوصلہ اور ان کے سینگوں کی مضبوطی پر محمول ہوتی ہے جو بزدل کمزور ہوتے وہ دو چار ہی ٹکروں میں بھاگ نکلے جو مضبوط تو انا ہوئے وہ تیس تیس ٹکروں تک لڑے۔

اس دوران میں تماشائیوں پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ اپنے اپنے سُورما کا دل بڑھانے کے لئے اس کے حریف کو ننگی ننگی گالیاں دیتے ہیں۔ آپس میں لمبی لمبی شرطیں لگاتے ہیں۔ اور ذرا سے اشتعال پر خود بھی لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مینڈھوں کے مالک اپنے اپنے مینڈھوں کی تعریف ضرور کرتے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے ساتھیوں کو ڈانٹ کر مشتعل ہونے سے روکتے رہتے ہیں۔ لیکن مینڈھے کے ہار جانے پر کبھی کبھی وہ بھی عنانِ ضبط ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں۔

کہتے ہیں ایک دفعہ ٹھاکر اجیت سنگھ کا ایک مینڈھا جو پچھلی ٹکر میں منہ موڑ کر قطار کو پھاند کر بھاگ گیا۔ جیتی ہوئی پلٹی کے فاتحانہ نعروں نے ٹھاکر صاحب کو گرما دیا۔ ان کی بھی "حیثیت بھتی ہوا تی" تھی۔ خود میدان میں پھاند پڑے اور اپنے داہنے اور بائیں بازو دونوں پر فاتح مینڈھے کی چار ٹکریں لے لیں۔ اور پھر سینہ تان کر بیٹھ گئے "آؤ اس پر بھی سہی!" گاؤں کے دوسرے ٹھاکر انھیں میدان سے کھینچ لائے۔ ورنہ شاید مینڈھے کی شکست اجیت سنگھ کی موت کا پیش خیمہ بنتی۔

اسی ہزیمت کا اثر تھا کہ وہ اسی سال چھتر سے سوا سو کا مینڈھا لائے۔ مینڈھا کیا تھا، ایک چھوٹا سا ٹٹو تھا۔ بڑا سا ڈیل ڈول بڑے بڑے گھومے ہوئے سینگ اُن میں جا بجا پیتل کے پتر جڑے ہوئے تھے۔ مشہور تھا بہار بھر میں اس سے کوئی مینڈھا جیت نہیں سکا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے بھی اس کی داشت پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ اور بیس کوس تک اور دگرد تین برس تک ہر مینڈھے کو ہرایا۔ چوتھے سال سہین پور کے ٹھاکر صاحب بھی اس کا مقابل ڈھونڈھ لائے۔ اب جو دونوں میں مقابلہ ہوا تو معلوم ہوا کسی نے ایورسٹ اور کنچن جنگا کو ٹکرا دیا۔ پچیس ٹکروں تک کسی میں کوئی کمزوری محسوس نہیں ہوئی۔ چھبیسویں میں دونوں لڑکھڑائے۔ لڑانے والوں نے حریف ہی کی کمزوری کو محسوس کیا، خود اپنے مینڈھے پر نظر نہیں کی۔ نعروں سے دل بڑھایا۔ جانور دو اور ٹکریں شور و شغب میں لڑ گئے، مگر انتیسویں ٹکر میں دونوں کے ایک ایک سینگ ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئے اور دونوں کے سروں سے اس زور کے خون کے فوارے چھوٹے کہ آس پاس کے سارے لوگ رنگین ہو گئے۔ حریف پیچھے ہٹ کر جھومے اور وہیں ٹیں کر کے گر پڑے۔ دونوں ٹھاکروں نے اپنے اپنے پہلوانوں

کو گود میں اٹھا لیا۔ مہین پور والا تو آقا کی گود میں پھڑک کر وہیں مر گیا لیکن اجیت سنگھ والا دو دن جیتا رہا پھر اس نے بھی ہمیشہ کے لیے آنکھیں پھیر لیں۔ اجیت سنگھ نے پورا سوگ منایا۔ اس کی "ٹکٹی" بنا کر باجے کے ساتھ کبڈیاں لٹاتے شمشان تک لے گئے وہاں پروہتوں نے جانور کو جلانے کی اجازت نہیں دی۔ مجبوراً وہیں گنگا کے کنارے اسے مٹی میں "توپ آئے"۔ لیکن گھر آکر بھدرا کیا، سر، داڑھی، مونچھ کے بال منڈوا ڈالے اور تین دن تک گھر سے باہر نہیں نکلے!

ٹھاکر بھی شیوخ کی طرح خود ہل نہیں جوتتے اور نہ مویشی چراتے ہیں اس کے لئے "ہلواہے" اور "چرواہے" رکھے جاتے ہیں۔ 'ہلواہے' زیادہ تر چمار ہوتے ہیں اور 'چرواہے' اہیر۔ یہ گھر سے بھینس، گائیں ہنکالے جاتے ہیں اور شام کو انھیں گاؤں کے اندر کر کے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ 'ہلواہے' غریب دن بھر بیل کی طرح جُتے رہتے ہیں۔ وہی گھاس بھی کرتے ہیں، وہی کروی بھی کاٹتے ہیں اور وہی ناند اور گوبر بھی صاف کرتے ہیں۔ اندر باہر کے دوسرے کام کہار اور کہاریاں کرتی ہیں۔ کہاریاں چونکہ اکثر ٹھاکر صاحبان کی منظورِ نظر ہوتی ہیں اس لئے انھیں ان کے مزاج میں ٹھکرائنوں سے زیادہ دخل ہوتا ہے۔ کہار یہ چیرہ دستیاں پرجا اور محکوم ہونے کی وجہ سے انگیز کرتے ہیں۔ پھر انھیں کبھی کبھی عوض معاوضہ گلہ ندارد کے اصول پر عمل پیرا ہونے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ عمل ردِ عمل چونکہ اصولِ فطرت ہے اس لئے کسی کو یہ امور عجیب محسوس نہیں ہوتے اور نہ ان کی وجہ سے بستی میں کوئی غوغا ہوتا ہے۔ ہاں ہنگامہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی نوجوان بیوہ سسرال والوں کی بے اعتنائیوں یا فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کسی کے

ساتھ بھاگ نکلتی ہے اس زمانے میں دو ایک مہینے قرب و جوار میں کہیں نہ کہیں خون ہو جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ پھر سب اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ ہل چلنے لگتے ہیں۔ گیہوں بویا جانے لگتا ہے۔ ایکھ پیلی جانے لگتی ہے۔ گڑ سونے کے داموں بیچا جانے لگتا ہے۔ ٹھاکر ٹھاکر کی جنگ، ٹھاکر اہیر کی لڑائی اور ٹھاکر شیخ کی مقدمہ بازی چھڑ جاتی ہے واقعی جاگیردارانہ نظام کی مشین دھن کی پوری ہے، کام کی پکی!"

ادھر دس برس میں کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ شیخن پور کے مکانات زیادہ تر زمین دوز ہوتے جا رہے ہیں۔ وہاں کے بہت ہی کم زمیندار خود کاشت کرتے ہیں سو فیصد غلہ خرید کر کھانا پڑ رہا ہے۔ گیہوں دس سیر سے گھٹ کر چار سیر کا بکا۔ اب تو ڈیڑھ سیر کا ملتا ہے۔ جو سوا دو سیر، چنا مٹر ڈھائی سیر۔ پھر سال دو سال سے وزن کے یکساں کر دینے کا حکم بھی جاری ہو گیا ہے۔ ان دیہاتوں کا سیر ۲۴ گنڈے ۳۰ گنڈے کا تھا۔ اب شہروں کی طرح یہاں بھی بیس گنڈے کا رائج ہے۔ وہ بڑے بڑے شیوخ جو ہر وقت اجلے کپڑے پہنے مرغ زریں بنے پھرتے تھے اب گاڑھے کے کرتے اور مارکین کے پائجامے پر اتر آئے ہیں۔ بقول ان کے "نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا، نہ پیٹ بھرنے کو غلہ! اب ایسے میں شرافت کہاں؟ چنانچہ یہ کپڑوں والی شرافت تو گئی۔ چمار بھی فوج میں بھرتی ہو کر دور دیس کی سیر کر آئے۔ اب وہ نہ مزدوری کرتے ہیں۔ نہ بیگار دیتے ہیں۔ حکومت نے بھی زمینداروں کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ پھر رعایا کو لال کرتی والے بھی بہکاتے ہیں۔ الٹی سیدھی سکھاتے رہتے

ہیں۔ اس لئے گارا کون دے یا مکانوں کی مرمت کون کرے، کھپریل پر کون چڑھے؟"

بڑے بوڑھے ہر وقت "نون تیل لکڑی" کی فکر میں لگے رہتے ہیں تو جوانوں کو بنگال و بہار کے فساد نے "چائے، بیڑی، ناریل، کھجور لانے والوں کی خاطر تواضع سے بھی محروم کر دیا ہے۔ اب نہ چھیڑ ہے نہ چہل، نہ حسن و عشق کے تذکرے ہیں، نہ طفلی و شباب کے ولولے اب وہی "کہ یاران فراموش کردند عشق" والا معاملہ ہے

رشید نے پوچھا "میاں محمود مٹی کے تیل کا کچھ انتظام ہوا؟"

محمود نے جواب دیا "ارے یار کچھ نہ پوچھو۔ سرپنچ کے ہاں درخواست لے کر گیا انھوں نے لکھا "گاؤں کے بڑے زمیندار ہیں۔ ان کو دو پیسہ روزانہ کی جگہ ایک آنہ روزانہ کا تیل ملنا چاہیے"۔ تیل والے کے پاس حاضر ہوا۔ وہ رعونت سے بولا "میاں "سرپنچ کے لکھنے سے کام نہیں چلتا، سپلائی افسر کا حکم ہونا چاہیے"۔ پانچ روپے یکّہ والے کو دیے سپلائی دفتر گیا۔ دس بجے پہنچا، معلوم ہوا دو بجے صاحب بہادر درخواست لیتے ہیں۔ چار گھنٹے کھڑا رہا۔ اس لئے کہ برآمدے میں نہ کرسیاں تھیں نہ بنچیں۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا تھا۔ تو اس پر ایک بُلڈاگ چپراسی ٹانگ پھیلائے بیٹھا تھا۔ بارے پکار ہوئی "سائل آئیں" یہ بھکاری بھی گیا، سلام کیا۔ گردن بھی نہ ہلائی۔ صرف نظر اٹھا کر دیکھ لیا۔ درخواست پیش کی پوچھا کیا ہے؟ روداد عرض کی حکم ہوا "سرکار کے پاس ابھی تیل کی کمی ہے اس لئے کوئی رعایت ممکن نہیں!"۔ اپنا سا منہ لے کر چلا آیا۔

شعیب بولا "میں تو بھئی انھیں خوشامدوں سے بچنے کے لئے آج کل کڑوے تیل کا دیا جلاتا ہوں"۔

رشید نے پوچھا "اور قیوم تم ؟"

محمود بات کاٹ کر بول اُٹھا "ان کی نہ پوچھو۔ یہ اس اندھیرے سے ہر طرح فائدے میں ہیں۔ ٹوٹے لئے میں جب پیر ہاتھ پڑ گیا، انھوں نے وصول کر لیا۔ کبھی جہاں آرا کی ماں! کبھی غفوریا کی خالہ!" قیوم غصّہ سے بوٹیاں نوچنے لگا۔ بولا "محمود تمھاری باتیں زہر میں بجھی ہوتی ہیں!...."

رشید نے نمک پاشی کی "ہاں جی! تم کبھی بھولی بسری باتوں کو یاد دلاتے ہو!"

شعیب نے منہ سکھا کر کہا "نیشِ عقرب نہ از پئے کیں است!...."

اتنے میں شیخن بابا نے اذان دینا شروع کی "اللہ اکبر! اللہ اکبر!"

دوستوں نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔

رشید بولا "ارے آج کوئی کھانے پر کہہ رہا تھا! مولوی عبد القدوس آ گئے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

محمود نے بڑی ٹھنڈی سانس بھری "ہاں یار خیریت چاہتے ہو تو بس جلدی سے وضو کر لو!"

شعیب نے کہا "نہیں تو!"

محمود نے کہا "پھر میلاد پڑھانا پڑے گا!"

اور مضمحل تھکے مسجد کی آستاں سائی کرنے لگے۔

ادھر خیدو میاں کے ہاں آج ٹھاکر گنج کے لوگ بھی بیٹھے تھے اور شیخن پورا کے سب چھوٹے بڑے زمیندار بھی موجود تھے۔ تحصیلدار کا گاؤں میں کیمپ تھا،

سب وہیں سے آئے تھے۔

اجیت سنگھ نے کہا "چندو میاں آپ نے یہ سُنا کہ کل اخبار میں چھپا ہے کہ بہار میں زمینداری ختم کر دینے کا قانون پاس ہو گیا"

چندو میاں نے مُنہ سکھا کر کہا "جی ہاں، اس صوبے میں کبھی تو ہمارے گلوں پر چھُری پھیرنے کی طیّاری ہو رہی ہے"

حسّا میاں بولے "یہ جو اس روز روز کی دھکی نے تو ادھ مار ڈالا ہے۔ ہر وقت کے نخرے ڈبے نہیں سہے جاتے صاحب ایک مرتبہ حکم دے دیں کہ زمینداری چھین لی گئی۔ تم لوگ سب ڈنڈے بجاؤ، چلو معاملہ ختم ہوا۔ یہ تڑپا تڑپا کر مارنا کیا!"

ہر سنگھ اکڑ کر بولے "ارے کوئی مجاک ہے جمینداری چھین لینا۔ ہمارے ہاتھ میں جیسے لاٹھی ہی نہیں!"

اِنّو میاں نے کہا "ہر سنگھ تم حکومت سے نہیں لڑ سکتے۔ سرکار کا مقابلہ لاٹھی سے نہیں کیا جا سکتا۔۔۔"

چندو میاں ذرا مسکرائے "ٹھیک کہتے ہو اِنّو میاں۔ اس کا مقابلہ صرف قانون ہی کر سکتا ہے، قانون! میں اسی لئے کہتا ہوں کہ آؤ ہم لوگ سوچ کر کوئی قانونی پیچ نکالیں"

اِنّو میاں نے بات کاٹی "قانون انھی نے بنایا ہے۔ آپ اُس سے کیا "قانون بگھاریں گے"!

اجیت سنگھ نے بڑی بے بسی سے کہا "تو پھر ہم سب زمیندار کریں گے کیا؟"

امجد میاں جو کانگرسی خیال کے تھے، ہنسے۔

"ٹھاکر صاحب! اب آپ وہی کریں گے جو صدیوں سے چمار، پاسی، مہتر اور

دوسرے آپ کے بنائے ہوئے "چھوٹے لوگ" کرتے آرہے ہیں، "فاقہ!......"

بیر سنگھ پھر گرمایا۔" ارے گھر چلو کاکا، تم بھی سکھن کی رائے چاہت ہو۔ یہ سدا کے نربل رہے ہے۔ ابھی مہریا کی سمان بیٹھے رہیں گے اور کا کریں گے!"

اِلّو میاں نے جلدی جلدی نوکیلی مونچھ کو اس طرح دونوں ہاتھوں سے نیچے کیا کہ سب ہنس پڑے۔ وہ بولے "ہاں بھئی ہماری مونچھ نیچی ہی رہے گی، اگر ہم حکومت سے نہیں لڑیں گے۔"

امجد میاں بولے "اس میں مونچھ اونچی رہنے کا سوال ہی نہیں۔ سرکار ہماری ہے ہم اس کے ہیں۔ وہ کہتی ہے سو آدمیوں کے لئے ہزار آدمی بھوکے ننگے نہیں رکھے جا سکتے آج تک زمینداروں نے رعایا کو بھوکا ننگا رکھ کر خوب خوب عیش کئے۔ یہ جنتا کا زمانہ ہے، جمہور کی حکومت ہے۔ اس لئے ہم وہی کریں گے جس میں جمہور کی بھلائی ہو۔"

چندو میاں نے پوچھا "تو کیا ہم جمہور میں نہیں؟"

امجد میاں نے کہا "جی نہیں، آپ تو ان لٹیروں اور گِدھوں میں سے ہیں جو جنتا کی لاش اب تک نوچ نوچ کر کھا رہے تھے!"

بیر سنگھ بڑے غصے سے "ہونہہ!" کہتا اور پاؤں پٹکتا چلا گیا۔

چندو میاں نے پھر ہانک لگائی "ارے یارو، ان باتوں کا کیا نتیجہ؟ کوئی قانونی پیچ سوچو، قانونی پیچ!"

اِلّو میاں مونچھ اینٹھتے باہر جاتے جاتے بولے "جی، پتنگ کٹ گیا!"

اور امجد میاں کی ہنسی پر جوش سے بھڑکے ہوئے چہرے مرجھا گئے۔

لے عورت

"چمار ٹولی" میں سُکھو، دھنپت، سہدیو، نربتیا کھاٹ پر بیٹھے نریل پی رہے تھے سُکھو نے ہوائی اڈے پر کام کر کے اپنی حالت سنوار لی تھی۔ اس کا جھونپڑا مکان میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ پھوس کی جگہ کھپریل سے چھایا ہوا تھا اور اب اس کے صحن میں ایک کی جگہ دو جوڑ ناگوری بیل بندھے تھے۔ حال ہی میں وہ گورکھپور مہا سبھا کے جلسے میں بھی ہو آیا تھا۔ اب اُس کے تیور خاصے تیکھے تھے۔

دھنپت نے کسان کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ اس نے بڑے بڑے نیتاؤں کے درشن کر لئے تھے۔ اس نے ان کی جوشیلی تقریریں اپنے کانوں سے سُنی تھیں۔ اور اُن کے وعدوں پر اسے پورا یقین تھا۔ وہ اپنی جلد بازی میں بار بار یہی سوچتا "جب سب کچھ ہمارا ہی ہے تو ہم ان زمینداروں سے کیوں دبیں؟ کیوں نہ ابھی سے اُدیٹ کر سب چھین لیں؟"

سہدیو فوج میں بھرتی ہو کر افریقہ، اطالیہ، عرب و ایران کی سیر کر آیا تھا۔ جب سے واپس آیا تھا اس کا دل اُچاٹ تھا۔ اسے اپنی برادری والے ننگے بُھچے "چھوٹے لوگ" نظر آتے تھے، اور اُن کی زندگی ایسی جان پڑتی جیسے افریقی ریگستان میں کوئی بن پانی کے تڑپ رہا ہے۔

نربتیا گولر کا کیڑا تھا۔ صدیوں کے چمار کا نمونہ، اُن تمام صفات نیک و بد کا مالک جنہوں نے چمار کو چمار بنا رکھا ہے۔ دھنپت، سہدیو، سُکھو، اس کو دل میں بے وقوف سمجھتے۔ اس کی قدامت پرستی کا مضحکہ اُڑاتے، لیکن پنچایت برادری میں اس کے مشورے کے خلاف کسی اقدام کی ہمت نہیں کرتے تھے آج بھی سب اسے چھیڑ رہے تھے۔

سکھو نے کہا۔ "دادا، تم گورکھپور نہیں چلے، نہیں تو تم کو معلوم ہو جاتا، کہ پڑھے اس دیش کے راجہ تھے!"

نرپتیا نے منہ سکھا کر کہا "ہاں بھیا، انھیں کا بھوگ تو ہم بھوگ رہے ہیں!"

دھنپت نے کہا "واہ! اُن کا کیا کسور! یہ ہمارے کرم ہیں۔ ہم ہاتھ پاؤں ڈالے بیٹھے ہیں، نہیں تو جب چاہیں پھر راجا بن جائیں!"

مہدیو بولا "بس ایک مسین گن میں سارے سِکھ اور ٹھاکر ساپھ!"

نرپتیا ہنسا "ہونہہ! جیسے! یہاں کوئی کانون ہی نہیں!"

دھنپت نے کہا "ہوگا کانون! پر ہتیا ہماری جمیندار کون ہیں؟ کھیت باری، گاؤں سب ہمارا ہے!"

نرپتیا نے کش لے کر کہا "ہاں، پر جب سرکار تمھیں دے گی جب!"

سکھو اُلجھا "واہ سرکار کھد ہماری ہے۔ ہمیں نہ دے گی تو ہم بدل نہ دیں گے!"

نرپتیا نے نریل کھاٹ کے پائے سے ٹکا کر کہا "تم جیسو کروں کی ایسی بات پر گسّا آتا ہے۔ نہ سار پڑھے، نہ لکھے۔ نہ بھانت، نہ چال چلن۔ اور بات کریں گے ایسی کہ جان پڑتا ہے، سنگھاسن پر بیٹھے ہیں۔ سرکار ان کی ہے یہ اسے بدل دیں گے! بس اتنا اور کہہ دو کہ ہم ہی سرکار بن جائیں گے!"

مہدیو بولا "تو کا ہے ہم سرکار نہیں بن سکتے؟"

نرپتیا نے چراغ پا ہو کر کہا "بس تم سوچ میں کا ہو آئے کہ تم سمجھ لیو کہ تم سب کچھ جان لیو۔ ارے مورکھ یہ ودیا کا کام ہے، تم کا کا آوت ہے، کا جبر؟"

اتنے میں رام لکھن اہیر نے تالاب کے اُس پار سے آواز دی "سکھو، مہدیو، دھنپت ہو! چلو میاں بلاوت ہیں!"

سکھو نے تلملا کے کہا "کا ہے کو جی؟"

رام لکھن نے وہیں سے للکارا "ارے تحصیلدار صاحب کا چھوٹا بکس ٹیسن پر پہنچانے کو ہے اور کاہے کو!"

تینوں بڑبڑانے لگے۔ زبتیا ہنسا "جاؤ بھیّا، جاؤ! چمار جات اب گار کے لئے بنی ہی ہے۔ جمینداری نہ بھی ہوں گے تو سرکاری افسر تو رہیں گے اُو ہے بے گار لیں گے!"

سکھو، سہدیو اور ہنیت نے ایک دوسرے کا منہ دیکھا اور زبتیا کو ہنستا چھوڑ کر گردن جھکائے شیخن پور کی طرف چل کھڑے ہوئے راستہ بھر غصہ و ندامت سے وہ ایک دوسرے سے کچھ نہ بولے۔ جب تالاب کے اُس پار سے انھوں نے چمار ٹولی پر نظر ڈالی تو وہ اُن کو نہ دکھائی دی۔ شام کی بڑھتی تاریکی نے اُسے ڈھک لیا تھا۔ اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ دُور افق پر ایک ننھا سا ستارہ چمک رہا تھا!۔

سکھو تین کوس کی منزل مار کر جب لیٹا تو دیر تک اپنی دُبلی گردن اور سوکھی پنڈلیاں سہلاتا اور دباتا رہا۔ پھر بیوی نے ایک لوٹے میں پانی اور ایک تھالی میں دو موٹی موٹی مکئی کی روٹیاں اور پالک کا ساگ لاکر رکھ دیا۔ اس نے اسے بڑبڑا اور جھنجلا کر کھایا اور شلغہ پیا، اور سو رہا۔

اس نے خواب میں دیکھا وہ گاؤں کے میدان میں کھڑا ہے۔ اُس کی صورت ہی بدل گئی ہے اب تو وہ بالکل پارک بن گیا ہے۔ برابر سے گھاس کٹی ہوئی ہے۔ بیچ بیچ میں لال لال سڑکیں بنی ہیں۔ ان کی بغلوں میں پتلی پتلی کیاریوں میں طرح طرح کے پھول لگے ہوئے ہیں، بیچ میں ایک گھنٹہ گھر ہے اس کے گرد بنچیں پڑی ہیں۔ ایک کنارے پر ایک چرخا سا پڑا ہے، کچھ اور مشینیں بھی رکھی ہیں۔ جن پر زمینداروں کے

لڑکے، رعایا پرجا کے "لونڈے لونڈیاں" اہیر، پاسی، مہتر، چمار، شیخ، برہمن، ٹھاکر سب اُجلے صاف ستھرے کپڑے پہنے چڑھتے ہیں۔ پھسلتے ہیں، جھولا جھولتے ہیں اور ایک شور مچائے ہوئے ہیں، اور لالہ منوہر لال کھڑے ناک کے بانسے پر بار بار عینک ٹھیک کرکے اُن کی بے ربطی میں ایک ربط، ان کی غیر منظم حرکتوں میں ایک نظم پیدا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے منوا کو بھی انھیں میں دیکھ کر اچنبھے سے بوکھلایا ہوا اُدھر لپکا تو پاس والے کھیت میں کچھ اور ہی تماشا نظر آیا۔

وہاں چندو میاں اور راجیت سنگھ دو لوہے کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ اور دونوں پٹریاں اس طرح جمائے ہیں جیسے اب دوڑ ہونے والی ہی ہے اتنے میں ایک دوسری طرح کے گھوڑے پر سوار نریتیا بھی ان کے بیچ میں آکر کھڑا ہو گیا۔ ذرکھن مہتر نے جو پاس ہی کھڑا تھا، ایک سیٹی جیب سے نکال کر بجائی اور تینوں گھوڑے بھڑ بھڑا کر چلنے لگے نہ انھیں ایڑ لگانے کی ضرورت پڑی نہ چابک مارنے کی، نہ دُم ہی اینٹھی گئی نہ للکارے ہی گئے۔ اور اُدھر کھیت کا سینہ پھٹنے لگا۔ ایسی اچھی کیاریاں بننے لگیں کہ واہ، واہ۔ اِدھر نریتیا ہے کہ اس کا گھوڑا دانا گراتا جاتا ہے اور برابر کرتا چلا جا رہا ہے۔ سکھو منہ کھولے ابھی یہ دیکھ رہا تھا کہ اس نے ایک سرسراہٹ سی سنی۔ اور اب جو پلٹ کے دیکھتا ہے تو کمر کمر تک گیہوں سنہری بالیوں سمیت ایکڑ کا ایکڑ جھوم رہا ہے!"

وہ گھبرا کر لوگوں سے اس جادو کے کھیل کا راز پوچھنے کے لئے پلٹا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک پکی حویلی کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جھانک کر دیکھا تو یہاں سے وہاں تک ایک قطار میں گائیں بندھی دکھائی دیں۔ کوئی بھوری، کوئی کنٹھی، کوئی سپید، کوئی کالی، سینگوں میں تیل لگا ہوا، نہائی دھوئی صاف ستھری چکنی چپڑی، کھڑی جگالی کر رہی ہیں۔ دوسری طرف نظر ڈالی تو بیسیوں جمنا پاری بھینسیں دکھائی دیں۔ جلد چمک رہی ہے ایسا جان پڑتا ہے کہ تیل میں کوئلہ ڈال کر خوب

دل لگا کر لگایا گیا ہے۔ ہر ایک اتنی چوڑی چکلی ہو کہ اس کی پیٹھ پر ایک کھاٹ ڈال کر آدمی آنند کی نیند سو سکتا ہے۔ وہ ذرا آگے بڑھا تو اسے گاؤں کے کئی اہیر بھینسوں اور گائیوں کے تھنوں کے نیچے بڑی بڑی بالٹیاں رکھے دودھ دوہتے دکھائی دیے۔ سپید موٹی دھاریں دیکھ کر اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ ادھر لپکا ہی تھا کہ ٹھاکر بیر سنگھ چپراس لگائے اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"سکھو تمہارا ہی نام ہے — "ہاں بجور!" — چلو تمہیں پنچایت عدالت میں بلایا جا رہا ہے۔

"سکھو بڑا اچنبھا ہوا۔ اس نے چمار پنچایت، اہیر پنچایت، کوری پنچایت، غرض ہر قوم کی پنچایت تو ضرور سُنی تھی۔ دو ایک میں پنچ بھی بنا تھا۔ لیکن اس نے آج تک پنچایت عدالت نہ سُنی تھی نہ اُس نے کسی پنچایت کا چپراسی دیکھا تھا۔ وہ ذرا اکا جھنجلایا، ٹھرایا —

"کیوں جائیں؟ ہم کو فُرصت نہیں!"

بیر سنگھ نے کلائی پکڑ لی "سیدھے چلنا ہے کہ کھینچ کر لے چلوں" سکھو نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا "چلتے ہیں جی۔ دھونس کیوں جماتے ہو۔"

دونوں؛ اِتّو میاں کے گھر آئے۔ دیکھا تو صدری دالان میں ایک میز کے گرد پانچ آدمی بیٹھے ہیں اور سامنے والی پنچ کی کرسی پر ملکھی ہارے کی نرپتیا بہو بیٹھی ہے۔ ارد گرد بیٹھنے والوں میں جہاں ٹھاکر اور شیخ ہیں وہیں مہتر بھی ہے اور بندھو پاسی بھی ہے۔ اے رام یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مہتر، پاسی، چمار، شیخ، ٹھاکر سب ایک ساتھ بیٹھے ہیں۔ پھر پنچ ہیں۔ "بہو جی!" اس نے جلدی سے نرپتیا بہو کو مخاطب کیا۔

"کیا ہے بھلو جی؟"

بیر سنگھ نے ڈانٹا "یہ عدالت ہے، یہاں رشتہ ناتا نہیں چلتا۔ سرکار کہہ کر بات کرو!"

سُکھو نے سہم کر ہاتھ جوڑ ما " ہجور !"

ثریتیا بہو نے اِتّو میاں سے پلٹ کر کہا " مجھ کو اس کا کسور سُنائیے "

اِتّو میاں نے کاغذات اُلٹ پلٹ کر کہا " تم پر یہ الزام ہے کہ تم گاؤں میں کوئی کام نہیں کرتے !"

سکھو کو غصّہ آگیا ، وہ گالی دے کر بولا " کون .... کہتا ہے کہ ہم کام نہیں کرتے ...."

بیر سنگھ نے ڈانٹا " جبان سنبھال کر بات کرو جی ! یہ عدالت ہے !"

سکھو پلٹ پڑا " واہ ٹھاکر داہ ، بھوجی بیٹھی ہیں پوچھ لو - ابھی رات ہی تحصیلدار.... کا اسباب ٹیسن ڈھو کے لے گیا !"

ثریتیا بہو نے مسکراتے مسکراتے منہ سُکھا کر کہا " یہ کئی سال پہلے کی بات کہتا ہے - یہ ابھی پنچایت کا نون نے جو گاؤں میں انقلاب کیا ہے ، اس کو نہیں جانتا - اسے گاؤں کے ودّیالے میں لے جاؤ کہ اسے پڑھا لکھا کر آدمی بنائیں !"

سکھو بولا " واہ بھوجی واہ ! خوب حکم دیا ہم جیسا بڑھا تو تا اور ودّیالے ! ......"

بیر سنگھ نے کہا " بکو مت ! چلو !" اور انھوں نے سکھو کی کلائی پکڑ کر کھینچی ـــــ

سکھو کی آنکھ کھل گئی - دیکھا تو سہدیو ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑ رہا ہے -

" اُٹھو یار ! سورج نکل آیا ! جمینداری آج سے کھتم !"

سکھو نے مسکرا کر کہا " سچ ؟ "

سہدیو سینہ تان کر بولا " ہاں ہاں ! کانون پاس ہو گیا !"

سُکھو اس طرح مسکرا دیا کہ اس کے ٹوٹے ہوئے دانت صاف دکھائی دینے لگے -

---

125

گاؤں کی لاج

سنہ ۱۹۵۴ء

۱۹۲۷ء کی بات ہے کہ لکھن پور میں دو زمیندار رہتے تھے۔ ایک کا نام تھا امراؤ سنگھ، دوسرے کلدلدار خاں دونوں بدیشی راج کے خطاب یافتہ تھے۔ امراؤ سنگھ کو انگریزوں نے رائے صاحب بنا کر نوازا تھا اور دلدار خاں کو خاں صاحبی دے کر ممتاز کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک میان میں دو تلوار، ایک مملکت میں دو سلطان اور ایک کچھار میں دو شیر نہیں رہتے۔ لیکن لکھن پور میں رائے صاحب اور خاں صاحب دونوں موجود تھے۔ دونوں خاندانی رئیس تھے۔ اگر رائے صاحب کئی سیڑھیاں پھاند کر رائے پتھورا سے ناتا جوڑتے تو خاں صاحب اللہ داد خاں شرقی صوبیدار تک کسی نہ کسی طرح اپنا سلسلہ پہنچاتے۔ دونوں کے مزاج میں گھمنڈ اور غرور تھا اور دونوں کو اس کی کد رہتی تھی کہ میری بات اور میری مونچھ اونچی رہے۔

لکھن پور بالکل یو۔پی کے دوسرے قصبوں کی طرح ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ آٹھ ہزار کے قریب آبادی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے بازار تھے کچے پکے مکانات، پھوس کے جھونپڑے، ناہموار کچی سڑک، تنگ غلیظ سے بھری گلیاں، ننگے بھوکے کسان و رعایا پرجا کے لڑکے، بازاروں سے جانوروں کے ریوڑ صبح شام گزرتے ہوئے، سوکھے، خارشت زدہ، یہ قوم کتے ادھر اُدھر لوٹتے ہوئے، بازار کی ہر چیز پر

گرد کی چادر چڑھی ہوئی یا مکھیوں کی نشست و برخواست کی چھاپ پڑی ہوئی۔ قصبہ بھر میں صرف دو شاندار پختہ عمارتیں تھیں۔ بلند کرسی، بلند آستاں، وسیع صحن، بڑے بڑے کمرے، دالان، مردانے و زنانے حصّے الگ الگ۔ بلند بلند دیواروں کے حلقے میں خانہ باغ۔ یہ تھیں کوٹھیاں دونوں مالکوں کی۔ ایک قصبہ کے بچھمی حصّہ کی حدود دوسری پوربی حصّہ کی گویا قصبہ فرش تھا اور میرِ فرش تھے یہ دونوں مکان۔ پورب کا حصّہ رائے صاحب دبائے ہوئے اور پچھم کا کونا خاں صاحب۔

لکھن پور کا ٹپوارہ ہو گیا تھا۔ بازار، آبادی، کھیت باغ رائے صاحب اور خاں صاحب کے نام سرکاری کاغذوں میں الگ الگ لکھ گئے تھے۔ مگر ہر برسات میں کسی نہ کسی کھیت کی منڈھ چڑھنے گھٹنے پر دونوں میں فوجداری ضروری تھی۔ ان دونوں کا نہ اپنا سر بیٹھتا تھا، نہ ان کی ہڈیاں ٹوٹتی تھیں۔ گماشتے، کارندے رعایا پرجا آخر کس دن کام آتے۔ انھیں حقِ نمک تو ادا کرنا ہی تھا۔ اس لئے ان کی آویزش کے لئے معمولی بہانے بھی کافی تھے۔ کسان اکثر مشترک ہوتے۔ ایک ہی آدمی رائے صاحب کا کھیت بھی جوتتا، خاں صاحب کا بھی۔ اگر خاں صاحب کے حصّے میں بسے ہوئے اسامی پر رائے صاحب نے دعویٰ کیا یا رائے صاحب کی رعیت پر خانصاحب نے بقائے لگان کا مقدمہ دائر کیا تو زمیندار اور کسان میں مقدمہ بازی نہ ہوتی بلکہ زمیندار زمیندار میں۔ دونوں کو فوجداری کرنے اور دست گریباں ہونے کے لئے بس حیلہ چاہئے تھا۔

خاں صاحب کو اس کا گھمنڈ تھا کہ لکھن پور ہی نہیں بلکہ آس پاس کے سارے گاؤں بھی ۱۸۵۷ء کے پہلے تک ان کے بزرگوں کی ملکیت میں تھے۔ ان کے دادا نے

ہندوستان کی سب سے پہلی کوشش آزادی میں انھوں نے شدومد سے حصہ لیا اور انگریزوں نے اس کی یادداشت میں سوائے لکھن پور کے سب کچھ ان سے چھین کر رائے صاحب کے بزرگوں کو اس لیے دے دیا کہ انھوں نے بدیشی حاکموں کا ساتھ دیا۔ رائے صاحب کو اس کا گھمنڈ کہ ان کا خاندان حکومت کی نظر میں مقبول و ممدوح ہی نہ تھا بلکہ اس کی اکثر فردیں اچھی اچھی ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھیں اور وہ خود خطاب سے سرفراز کیے گئے تھے۔ ضلع کے حکام ان کے ہاں اکثر آتے رہتے تھے اور ہر نیا کلکٹر ان کے ہاں ایک بار دعوت کھانے ضرور آتا۔ خاں صاحب کو یہ عزت حاصل نہ تھی۔

انھیں یہ بات بہت کھلتی تھی اسی لیے جنگ عظیم میں انھوں نے رائے صاحب سے دگنا چندہ دیا اور دگنے سپاہی بھرتی کرائے۔ امراؤ سنگھ کو رائے صاحبی ملی، ان کو خاں صاحبی۔ مگر باوجود اس نئی سرفرازی کے خاں صاحب کا انگریزی سرکار میں وہ مان دان نہ تھا جو رائے صاحب کا تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہر نیا کلکٹر کام سنبھالتے ہی وہ خفیہ نوٹ ضرور پڑھ لیتا جو اس کے پیش رو ضلع کی نمایاں شخصیتوں اور خاندانوں کے متعلق لکھ گیا تھا۔ ان میں خاں صاحب کا خاندان مشتبہ اور رائے صاحب کے گھر والے وفادار لکھے تھے۔ دوسرے یہ کہ خاں صاحب کے خاندان میں اب تک انگریزی تعلیم کا چلن نہ تھا۔ ان کے ہاں یہی دستور تھا کہ تھوڑی سی عربی فارسی پڑھ لی، ادب تہذیب سیکھ لی اور شریفوں کی صحبت میں بیٹھنے کے قابل ہو گئے۔ بس اتنا کافی تھا گھر بیٹھ کر کھانے کو موجود ہی تھا کسی کی نوکری نہیں کرنا تھی۔ رائے صاحب کے خاندان میں بی۔اے، ایم۔اے کا زور

تھا۔ کوئی تحصیلدار تھا۔ کوئی ڈپٹی کلکٹر، کوئی وہیں ضلع کچہری میں مختار یا وکیل۔ غرض ایک گرتا ہوا، مٹتا ہوا خاندان تھا۔ دوسرا ابھرتا ہوا بڑھتا ہوا گھرانا۔ مگر مونچھوں کی لڑائی جاری تھی۔ خاں صاحب کے بھرے بھرے گالوں پر تھیں بھی وہ خاصی بڑی بڑی اور نوکیلی۔ بھلا وہ کیسے جھک سکتی تھیں۔ رائے صاحب نے کرزنی ریت پر عمل کیا تھا۔ وہ صفاچٹ تھے۔ روز داڑھی کے ساتھ ساتھ ان پر استرہ چلتا تھا مگر مونچھوں کا خیال دم کے ساتھ تھا۔ اسی لئے دونوں باوجود پچاس کے قریب ہونے کے ہر وقت ایک دوسرے کو نوچنے کاٹنے اور بھنبھوڑنے کے لئے تیار رہتے تھے بس یہی فکر کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ دوسرے کی ناک کٹ جائے۔ اور ہماری بات اونچی رہے۔ ان کی آپس کی رنجش ادھر اس لئے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ ایک گڑھیا پر بڑا سخت جھگڑا ہو گیا تھا۔ پچھلی برسات میں مہتو گڑھیا خوب بڑھی تھی۔ اس نے رائے صاحب کے کھیتوں کی تقریباً نصف بیگہ زمین اپنے پیٹ میں رکھ لی تھی۔ گڑھیا لگتی تھی خاں صاحب کے حصے میں اور وہی سالہا سال سے اس کی ساری سائر وصول کرتے تھے۔ اس کی مچھلیاں پکڑی جاتیں تو انھیں کے لئے۔ اس میں سنگھاڑے ڈالے جاتے تو انھیں کی اجازت سے اور اس سے آبپاشی کے لئے پانی لیا جاتا تو انھیں کے حکم سے۔ اب جو رائے صاحب کے کھیت گڑھیا میں بہہ کر مل گئے تو وہ بھی سائر میں حصہ بٹانے کے خواہشمند ہوئے۔ خاں صاحب نے کہا۔ "سبحان اللہ۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔ گڑھیا میری ہے۔ وہ جتنی بڑھے، جدھر بڑھے میری ہی رہے گی کہ وہ کسی اور گڑھیا میں منھ دھو رکھیں! حصہ بخرا کیسا؟" جب وہ زیادہ غرّائے تو یہ نوجداری کے لئے آمادہ ہو گئے۔ بارے انھوں نے خون کی ندی نہ بہائی بلکہ مقدمہ

دائر کر دیا کاغذات کی چھان بین ہوئی کھیت رائے صاحب کے بے شبہ نکلے، مگر گڑھیا خاں صاحب کی مقبوضہ ثابت ہوئی۔ اور اسی قبضہ کی بنا پر بورڈ تک سے رائے صاحب ہارے اور خاں صاحب جیتے۔ اس جیت پر جس طرح خاں صاحب کے ہاں چراغاں کیا گیا۔ خوشیاں منائی گئیں، اسی طرح رائے صاحب کے ہاں رنج کیا گیا اور سوگ منایا گیا۔ لگانے بجھانے والوں نے اس آگ کو خوب خوب بھڑکایا۔ رائے صاحب کو ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہنے لگی کہ کون سا موقعہ ہاتھ آئے کہ میں خاں صاحب کو اس طرح کی زک دوں کہ انھیں چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ اتنا ذلیل ہوں کہ مونچھ پرتاؤ دینا ہی نہ بھول جائیں بلکہ ساری ہیکڑی خاک میں مل جائے۔

اتفاق سے اسی زمانے میں خاں صاحب کی چھوٹی بیٹی کی برات آئی۔ دوسرے ضلع کے ایک مشہور رئیس کے لڑکے سے بات ٹھہری تھی۔ لڑکا تعلیم یافتہ بھی تھا اور منصفی کے لئے نامزد بھی ہو چکا تھا۔ خاں صاحب کے خاندان میں یہ پہلا حاکم آنے والا تھا۔ اس لئے ادھر جتنی خوشی، رائے صاحب کے ہاں اتنی ہی جلن کہ "نواب ان کے ہاں بھی سرکار میں رسوخ کا وسیلہ پیدا ہوا"۔

پرانے دستور کے مطابق خاں صاحب نے گھر گھر نیوتا بھیجا تھا۔ نہیں پوچھا تھا تو ایک رائے صاحب کو۔ بہت دنوں سے شادی بیاہ میں آنا جانا بند تھا۔ اس وقت جبکہ کھیت والے مقدمہ کی وجہ سے زخم ہرے تھے، اگر وہ پوچھتے بھی تو یہ اس نوید کو زخم پر نمک چھڑکنا سمجھتے۔ اس لئے وہ تو خوشی میں بھولے رہے اور یہ شریک نہ ہونے کے مصمم قصد کے باوجود نہ پوچھے جانے پر دل میں کڑھتے رہے۔

برات بڑی شان سے آئی۔ ہاتھی بھی تھے۔ گھوڑے بھی تھے۔ روشنی بھی تھی،

آتشبازی بھی تھی، بینڈ بھی تھے براتوں میں بڑے بڑے رئیس، مشہور بیرسٹر، وکیل، مختار، ایک ڈپٹی کلکٹر، دو تحصیلدار کئی داروغہ بھی تھے۔

برات کے اتارنے کے لئے قصبہ کے باہر، بڑی املی کے درخت کے نیچے شامیانہ تانا گیا تھا، کئی خیمے اور راؤٹیاں لگا دی گئی تھیں۔ وہیں ان لوگوں نے سر شام آکر آرام کیا، نہایا دھویا، کپڑے بدلے، چاء پی اور برات کے لیے تیار ہوئے بڑی املی سے لیکر خاں صاحب کی کوٹھی تک کی کچی سڑک خاص طور سے ہموار کی گئی تھی اور پانچ پانچ پانچ گز پر دورویہ جھنڈے گاڑے گئے تھے۔ رات کو دن بنا یا گیا تھا۔ کوٹھی میں جھنڈیاں، قندیلیں، کنول، گیسیں، ہار پھول، بیلیں، سارے سامان آرائش وزیبائش لگا کر اسے دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ بینڈ بجاتی انار چھوڑتی جب شان وشوکت سے برات کوٹھی میں بیٹھانی کے لئے آئی سارے قصبہ نے مہمانوں کے خیر مقدم میں حسب حیثیت حصہ لیا۔ اس مجمع میں رائے صاحب کے مختار عام ہمت رائے بھی تھے۔ کچھ تو وہ گاؤں کی ریت نبا ہنے آئے تھے، کچھ یہ خیال تھا کہ برات نکاح، کھانا، دان جہیز سب کچھ بغور دیکھیں گے اور ان میں قابل اعتراض پہلو ڈھونڈھ کر اپنے مالک کو سنائیں گے اور اخفیف حریف پر ہنسنے کا موقع دیں گے۔ یہاں بیٹھانی میں فقرہ بازیاں بھی ہوئیں، ضلع جگت سے بھی کام لیا گیا اور خواہ مخواہ براتیوں کی صورت شکل پر قہقہہ بھی لگایا گیا۔ دولہا کے گھوڑے سے اترتے ہی دونوں طرف والوں نے اس کی جگہ گھوڑے کی پیٹھ پر سب سے پہلے بیٹھ جانے کی کوشش کی لیکن پدر کا ایک جوان اس میں بازی لے گیا۔ گھرائی تالیاں بجا بجا کر خوب ہنسے۔ جب دولہا مسند پر بیٹھ چکا۔ تو دلہن والوں کی طرف سے خلعت پہنایا گیا اور قاضی جی اندر جا کر دلہن

کی رضامندی لے آئے۔ اب انھوں نے دولھا سے آہستہ سے پوچھا کہ اتنے مہر پر لالی بی بی سے نکاح منظور ہے۔ دولھا نے مہر کی رقم سنتے ہی صاف صاف انکار کر دیا۔

پہلے تو اسے لوگ رسمی روکد سمجھے۔ مگر جب بار بار پوچھنے پر دولھا "نہیں نہیں" کہتا گیا تو باپ کو رجوع کیا گیا۔ انھوں نے پوچھا کتنا مہر مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ بتایا کہ خاں صاحب کے خاندان میں صدیوں سے پچپن ہزار کا دستور چلا آتا ہے اور اسی پر اصرار ہے۔ انھوں نے کہا میں ایسے ناہنجار دستور وستور کا قائل نہیں۔ غرض اب بات بڑھی با اثر لوگوں نے دونوں طرف سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ان کی ضد تھی کہ ہم پانچسو ایک سے ایک پیسہ زائد نہ دیں گے، ادھر سے یہ کہ پچپن سے پونے پچپن ہزار نہ ہوں گے۔ اس سے خاندانی وقار کو ٹھیس لگتی ہے عورتوں کو طرح طرح کے وہم ہوتے ہیں۔ انھیں باتوں میں تیز تیز فقروں نے اور آپس کی نوک جھونک نے آگ لگائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دولھا کے باپ بول اٹھے۔ ہماری ڈالیں واپس کیجیے، ہم برات پلٹا لے جائیں گے۔

اب تو پورا قصبہ برہم ہو گیا لکھن پور کی ناک کٹ گئی۔ برات چڑھ کر آئی لڑکی والوں، بیٹھ گئی۔ وہ بغیر بیاہ کے باہر کیسے نکلے گی۔ دوسرے گاؤں والے طرح طرح کے نام دھریں گے۔ بس سارے گھروں سے لاٹھیاں نکل آئیں۔ آج براتیوں کی لاشیں ہی قصبہ سے اٹھ کر جائیں گی۔ اب تو ڈپٹی صاحب بھی گھبرائے، تحصیلدار صاحبان بھی اور داروغہ جی بھی لیکن خاں صاحب نے خلاف معمول بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ انھوں نے قصبہ والوں کو روکا سمجھایا یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں انھیں گاؤں سے صحیح سلامت واپس جانے دو۔ اسی میں ہماری بات اونچی رہے گی۔ اسی کے ساتھ

انھوں نے ایک ایک چیز گنوا کر سارے مجمع کے سامنے واپس کی۔ پھر ایک ایک سے خوشامد کی کہ نکاح نہیں ہوا، نہ سہی۔ لڑکی میں کوئی عیب نہیں۔ اللہ اس کو دوسرا بر دے گا۔ مگر کھانا تیار ہے۔ اسے کیوں برباد کیجئے۔ کھانا کھا لیجئے۔ مگر براتیوں نے ایک نہ سنی۔ سب یوں ہی بھوکے جائے قیام پر پلٹ گئے۔ لاری میں۔ موٹروں میں سامان رکھے جانے لگے۔

ہمت رائے ہنستے، کھل کھلاتے، رائیصاحب کے یہاں پہنچے وہ ابھی رسوئی سے اُٹھے تھے اور حقہ پی کر بستر پر آرام کے لئے جانے والے ہی تھے۔ ہمت رائے نے کھیسیں نکال کر کہا۔

"مبارک ہو سرکار۔ لیجئے، بھگوان نے خاں صاحب کو آج اتنا ذلیل کر دیا کہ اب وہ زندگی بھر سر نہیں اُٹھا سکتے برات دروازے پر چڑھ کر واپس گئی۔

رائے صاحب نے ایک بات پوچھی۔ چہرے پر مسکراہٹ دوڑ رہی تھی کہ دفعتاً سات برس کی موہنی دوڑی دوڑی باہر آئی "بابو جی! بابو جی! گھر میں آئیے، دیدی بلاتی ہیں۔" بیٹی پر نظر پڑتے ہی رائے صاحب کی ہنسی غائب ہو گئی۔ وہ سناٹے میں آ گئے۔ موہنی سے کہا "اچھا تو چل، میں آتا ہوں۔" مگر اندر نہ گئے۔ اٹھ کر ٹہلنے اور کچھ سوچنے لگے۔ ہمت رائے باتوں کی جھڑی لگائے رہے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی کہہ گئے کہ "اب تو کوئی عزت والا خاں صاحب کی اس لڑکی کو پوچھے گا بھی نہیں!"

رائے صاحب ایک بار گرج پڑے "کیا بکتے ہو جی، جیسی میری موہنی، جیسی تمہاری بیٹی، ویسی ہی ان کی لڑکی۔ گاؤں بھر کی ناک کٹ جائے گی اور تم ہو کہ تالیں بجا رہے ہو!"

ہمت رائے نے "جی! جی" کہا اور سٹ پٹا کر خاموش ہو گئے۔ رائے صاحب نے آدمی کو آواز دی۔ اچکن منگوا کر پہنی، سر پر منڈیل رکھی اور ہمت رائے سے بولے "دیکھو، میرے سارے آدمیوں کو بلاؤ کہ لاٹھیاں لے لیکر ساتھ چلیں۔"

تھوڑی دیر میں ایک آدمی لالٹین لئے آگے آگے اس کے پیچھے رائے صاحب اور ان کے پیچھے تقریباً بیس آدمی لاٹھیاں لئے ہوئے اس شان سے یہ دوسرا جلوس برات کی قیام گاہ پر پہنچا۔ گاؤں والے پہلے ہی سے موجود تھے۔ رائے صاحب کو دیکھتے ہی سب ان کے ساتھ ہو لئے۔

رائے صاحب نے آہستہ سے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ برات کو گھیر لو اور خود سمدھی صاحب کی طرف متوجہ ہوئے سمدھی صاحب کو غصہ اس لئے اور بھی زیادہ تھا کہ ان کے سارے براتی بھوکے تھے۔ خاں صاحب کے ہاں کھانے سے انکار کر کے تو چلے آئے تھے مگر اب آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے قصبہ کے سارے بازار دوکانیں بند تھیں اور کھلی بھی ہوتیں تو شاید ان کو ایک کھیل بھی نہ ملتی۔ یہ دوکاندار کھانا مہیا کرنے کی جگہ جوتے ڈنڈے سے ضیافت کرنے کے لئے تیار تھے۔

رائے صاحب نے ان کو سلام کر کے پوچھا۔ "آپ ہی لڑکے کے والد ہیں!"

وہ جھنجھلا کر بولے۔ "جی ہاں، میں ہی ہوں، آپ کا کیا نام ہے؟"

رائے صاحب نے بہت ملائمت سے کہا "جی! مجھ کو امراؤ سنگھ کہتے ہیں!"

وہ ان کی اور خاں صاحب کی عداوتوں کے حال سے اچھی طرح واقف تھے۔ خاں صاحب اب ان کے بھی دشمن تھے۔ اس لئے بہت خوش ہو کے بولے۔

"رائے صاحب! واللہ خوب ملے! جی آپ ہی کو تو آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ ابھی ابھی ڈپٹی نصراللہ خاں صاحب، تحصیلدار موہن سنگھ اور نخت بہادر کوتوال یہی کہہ رہے تھے کہ شاید رائے صاحب کو ہمارے آنے کی خبر نہ ہوئی ورنہ ہمیں اس طرح کی تکلیف نہ ہوتی!"

رائے صاحب نے کہا۔ "جی یہ ان کی اور آپ کی عنایت ہے، مگر آپ لوگوں کو تکلیف کیا ہے؟ یہ معلوم نہ ہوا۔ کیا خاں صاحب نے آؤ بھگت میں کوئی کمی کی۔ شامیانہ، قنمے، راؤٹیاں سب تو موجود ہیں۔ کھانا بھی میں نے سنا کہ انھوں نے بڑا اہتمامی پکوایا ہے۔ شہر کے حلوائیوں کے علاوہ بنارس سے کشمیری پکانے والے ہندوؤں کے اور لکھنؤ کے باورچی مسلمانوں کے لئے بلوائے ہیں۔"

وہ بولے۔ "جی وہ آئے ہوں گے سب، مگر ہم تو یونہی بھوکے جا رہے ہیں!"

رائے صاحب نے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ خاں صاحب کے چچا زاد بھائی منو خاں کی طرف پلٹ پڑے۔ "کیا آپ نے اپنے مہمانوں کو کھانا نہ کھلایا؟"

منو میاں نے کہا۔ خاں صاحب نے خود ان لوگوں سے فرداً فرداً کہا کہ برات شوق سے واپس لے جائیے مگر کھانا کھا لیجئے۔ ان لوگوں نے مانا ہی نہیں۔

سمدھی صاحب بولے۔ "جی، ہم خاں صاحب کے ہاں کا ایک دانہ بھی منہ میں ڈالنا اب حرام سمجھتے ہیں۔"

رائے صاحب نے تیور بدل کر کہا۔ "تو جناب ان کے علاوہ اس وقت اس قصبہ میں کوئی دوسرا آپ کو ایک دانہ بھی نہیں کھلا سکتا۔"

سمدھی صاحب نے گھبرا کر کہا۔ "تو یہ کہئے کہ آپ بھی انھیں لوگوں میں شامل ہو گئے۔"

رائے صاحب بولے۔ "جناب من، وہ خاں صاحب کی لڑکی ہو، یا میری، یا نتھو بھنگی کی، وہ گاؤں بھر کی بیٹی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں آپ صرف خاں صاحب کی ذلّت کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ آپ سارے گاؤں کی ناک کاٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

سمدھی صاحب جھلّا کر بولے۔ "تو رائے صاحب جس کی بھی ناک کٹے، ہم تو جا رہے ہیں۔"

رائے صاحب نے کہا۔ "جی بڑے شوق سے تشریف لے جائیے۔ مگر ایک تحریر دیدیجئے۔"

انھوں نے دیدے نکال کر پوچھا "کیسی تحریر؟"

رائے صاحب نے کہا۔ "جی یہی کہ آپ جتنی چیزیں ساتھ لائے تھے وہ سب آپ نے واپس پائیں اور بسلامتی جان و مال یہاں سے واپس جا رہے ہیں۔"

سمدھی صاحب نے غرّا کر پوچھا۔ "اور اگر تحریر نہ دیں تو؟"

رائے صاحب نے مجمع کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تو آپ خود ہی سمجھ لیں کہ آپ یہاں سے کیسی صورتیں لیکر جائیں گے!"

سمدھی صاحب بھڑک اُٹھے۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

رائے صاحب نے کہا۔ "کچھ نہیں۔ بس یہ کہ ہم سب چھوٹے آدمی ہیں۔ ہماری عقلیں بھی چھوٹی ہیں اور ہمارا پیمانۂ صبر بھی چھوٹا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنی ذلّت برداشت نہ کر سکیں تو ہم پر زیادہ تعجب کی گنجائش نہیں!"

سمدھی صاحب چیخ پڑے۔ "تو جناب آپ ہمیں دھمکا کر تحریر لکھوانا اور ہمیں

قانون کے شکنجے میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ یہ تو نہ ہوگا!"

ان کی آواز جو بلند ہوئی تو برائی سمٹ آئے۔ ڈپٹی نصراللہ نے بڑھ کر پوچھا "کیا معاملہ ہے رائے صاحب؟"

رائے صاحب نے کہا۔ "کچھ نہیں ڈپٹی صاحب۔ میں سمدھی صاحب سے ایک تحریر مانگ رہا تھا اسی پر وہ چراغ پا ہو گئے۔ اب آپ لوگ انھیں سمجھائیے۔ آپ قصبہ والوں کے تیور دیکھ رہے ہیں پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ براتیوں میں آپ سرکاری ملازم بھی شامل ہیں۔ اگر یہ اپنی بات پر اڑے رہے تو آپ لوگ بھی ان کے ساتھ پہلے اسپتالوں میں جائیں گے پھر دوسروں کی کچہریوں میں!"

سرکاری افسران جلدی سے سمدھی صاحب کو الگ لے گئے۔ انھیں بہت کچھ سمجھایا بجھایا۔ اپنی شرکت کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی۔ بالآخر ڈپٹی نصراللہ نے فیصلہ سنایا۔ برات خاں صاحب کے ہاں واپس جائے گی۔ اور نکاح پچپن ہزار ہی پر ہوگا۔ اور پھر بینڈ بجاتی برات واپس ہوئی۔ رائے صاحب بڑے پھاٹک تک ساتھ آئے۔ مگر وہاں سے اپنے آدمیوں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف مڑ گئے۔

خاں صاحب کو جب معلوم ہوا کہ رائے صاحب نے گاؤں کی لاج رکھ لی، مگر پھاٹک سے پلٹ گئے تو وہ قاضی صاحب کو روک کر بولے۔ "ٹھہر جائیے! نکاح ابھی نہیں ہوگا"۔ اور جلدی سے کوٹھی سے نکل گئے۔ لوگ گھبرا گھبرا کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ یا اللہ اب کونسا نیا فتنہ کھڑا ہوا۔ برائی ڈرے کہ کہیں گھر میں بند کر کے مرمت کرنے کا ارادہ تو نہیں۔ گھرانی پریشان کہ خاں صاحب کو کیا بات

ناگوار ہوئی کہ اندھیری رات میں یوں تن تنہا چل دیے۔ دو ایک ان میں سے پکارتے ہوئے پیچھے دوڑے۔ مگر خاں صاحب بالکل خاموش لپکے ہوئے سیدھے رائے صاحب کے مکان کی طرف بڑھے چلے گئے۔ وہ گردن جھکائے کچھ سوچتے ہوئے لالٹین کی روشنی میں چلے جا رہے تھے کہ خاں صاحب جاکر لپٹ گئے۔ وہ رائے صاحب کی گردن میں باہیں ڈال کر مشکل سے یہ کہہ سکے۔

"بھائی امراؤ سنگھ! میرا قصور معاف کرو۔ چل کر اپنی بیٹی بیاہ دو!"

تھوڑی دیر بعد براتیوں، گھراتیوں کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ آگے آگے لالٹین لئے آدمی ہے اور اس کے پیچھے رائے صاحب اور خاں صاحب ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے چلے آرہے ہیں۔

دالان میں پہنچکر خاں صاحب نے رائے صاحب کی طرف ایک ملتجیانہ نگاہ سے دیکھا۔ رائے صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"قاضی صاحب نکاح پڑھئے!" اور دونوں کے گالوں پر موتی ڈھلک آئے!

لاٹھی پوجا

۱۹۵۵ء

ہریا لاٹھی پر ٹیک لگائے آم کے باغ میں کھڑی تھی۔ چار بج چکے تھے۔ مگر اب تک لُوں چل رہی تھی۔ دھوپ ہریا کے کندنی رنگ کو تپا کر گلابی بنا رہی تھی۔ جسم میں شعلے سے لپٹتے محسوس ہوتے۔ کھیتوں میں سے ایک سیاہی مائل لہر سی اُٹھتی اور باغ کی طرف دوڑتی دکھائی دیتی۔ ہوا کے ان جھونکوں سے باغ کی جھاڑیاں اور سوکھی لمبی گھاس میں پھنسے ہوئے، اٹکے ہوئے خشک پتے کھڑکھڑاتے اور درختوں کے ہرے پتے پھڑپھڑانے لگتے۔ شریر ہوا ہریا کے آنچل کو جھولے کی پینگ دیتی اور ساری کے نچلے حصّے کو غبّارہ بناتی تھی۔ مگر ہریا ہر بات سے بے خبر لاٹھی پہ ٹھوڑی رکھے فضا پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

باغ والی گڑھیا میں اس کی بھینسیں پڑی تھیں۔ گڑھیا میں پانی نام ہی کو تھا۔ مئی کے مہینے میں یو۔پی کے سارے تال تالاب سوکھ جاتے ہیں۔ یہ گڑھیا ذرا گہری تھی اس لئے اس کے بیچ میں کیچڑ نما پانی گھٹنوں گھٹنوں اونچا اب بھی باقی تھا۔ اسی میں ہریا کی چاروں بھینسیں لیٹی، بیٹھی اپنے کو ٹھنڈا کر رہی تھیں۔ گائیں ذرا زیادہ نازک مزاج اور صفائی پسند ہوتی ہیں۔ انھیں کیچڑ میں لت پت ہونا نہیں بھاتا۔ ہریا کی گائیں کبھی کچھ دیر تو بھینسوں کو کچھ رشک، کچھ حقارت سے دیکھتی رہیں پھر باغ

میں جاکر سوکھی گھاس نوچنے لگیں یا درختوں کی آڑ میں بیٹھ کر جگالی کرنے لگیں۔

باغ تھا قلمی آموں کا۔ اب کے فصل اچھی آئی تھی۔ گاؤں کا کھٹک اسے پہلے ہی خرید چکا تھا ——— وہ اپنی چھوٹی سی منڈیا میں بیٹھا ہریا اور اس کے مویشیوں کی حرکتوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا آم سے لدی ہوئی شاخیں کہیں ہریا کو ہاتھ لپکانے پر مائل نہ کردیں۔ یا کوئی گائے گردن بڑھا کر پتیاں کھانے اور پھل گرانے پر تیار نہ ہو جائے۔ لیکن آنکھیں اپنے پھلوں کی نگہبانی کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی دیکھ رہی تھیں۔ وہ تھیں ہوا سے بار بار کھلتی ہوئی گوری گوری پنڈلیاں اور آنچل کے پردے سے نکل کر لہرانے والی کالی کالی ناگنیں! ہریا کھٹک کے وجود سے بے خبر لاٹھی پر ٹھوڑی رکھے کھڑی تھی۔

داہنا ہاتھ تو لاٹھی کو سیدھا رکھنے میں لگا تھا۔ بائیں ہاتھ سے کبھی وہ آنچل برابر کر لیتی، کبھی سر کے اڑتے ہوئے بال کو اور کبھی ساری کے پھولتے ہوئے نچلے حصہ کو دبا دیتی رہتی تھی۔ اس کے جسم میں ایک لہر سی دوڑتی، وہ ببول کی ٹہنی کی طرح ہلتی، جھکتی اور سنبھلتی تھی، اور اس کی انگلیاں پھاؤڑا بنانے والے انداز سے کھلتی، مڑتی اور سمٹتی تھیں۔ مگر یہ سب کچھ ہو رہا تھا بے جانے بوجھے۔ ہریا اپنے خیالات میں غرق بس کھڑی سوچ رہی تھی۔ ہائے! کتنی بدل گئی اس کی دنیا بیوہ ہوتے ہی! لچھمن کی زندگی میں کبھی اسے اپنے مویشی چرانے کے لئے خود نکلنا پڑا تھا۔ بیسیوں آدمی خوش خوش ایسے فرائض مفت انجام دے دیا کرتے تھے۔ لچھمن اپنی لاٹھی کے لئے دور دور مشہور تھا۔ ضلع میں کوئی بڑی فوجداری نہیں ہوئی تھی جس میں لچھمن شریک نہ ہوا ہو۔ وہ دو مرتبہ اس سلسلے میں سکے ٹکر بھی ہو آیا تھا۔ بڑے بڑے ٹھاکر اس سے

دیتے تھے اور اس سے ڈرا مانگتے تھے۔ وہ جس کی طرف ہو جاتا اس کی جیت یقینی تھی کھیتوں پر قبضہ کرنے، اُن میں پانی چڑھانے اور درختوں کے کٹوانے میں ہمیشہ گاؤں میں دو پارٹیاں ہو جاتیں۔ جس کو گھسن کی پشت پناہی حاصل ہوتی وہ ساری زبردستیاں کر لیتا۔ کوئی اس سے نہ بولتا۔

ہیرا نے اس طاقت اور رعب کا مزہ چار برس اُٹھایا تھا۔ خود اپنے گھر میں بھی کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ دس بیگہ کھیت جوت میں تھے۔ ہلواہی، پُروائی، ہکائی کٹائی، سارے کام مفت میں انجام پا جاتے۔ گیہوں، ارہر، چنا، مٹر، اکھ سب ہی کچھ اس کے کھیتوں میں ہوتا اور اتنا ہوتا کہ بیچا جاتا۔ زمینداری کے زمانے میں اتنی کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس سے کوئی لگان وصول کر لیتا۔ اب جب سے وہ ان کھیتوں کا بھومیدار بن گیا تھا، سرکاری لگان تو دینا ہی پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ تھا ہی کتنا۔ پیداوار کے مقابلے میں بہت ہی کم۔ غلّہ

دس گائیں اور چار بھینسیں تھیں۔ ان کا دودھ، دہی، گھی بیچ کر ڈھائی سو ماہوار آ جاتے۔ کھانے والے اور خرچ کرنے والے صرف میاں بیوی۔ دو نفر! اس پر ترکاری مفت آتی تھی۔ اپنے اور آس پاس کے گاؤں والے کوری ہر فصل کی چیز نذر دے جانا فرض سمجھتے تھے۔ ان کو ڈر تھا اگر "بھوگ" چڑھانے میں ذرا بھی دیر ہوئی تو پورا کھیت چرا دیا جائے گا یا اُکھاڑ دیا جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ سہاگ کے چار برس میں ہیرا سونے میں پیلی بن گئی۔ وہ تو موتیوں میں سفید بھی بن جاتی، اگر وہ پہاتن نہ تھی، وہ کبھی اُن پڑھ۔ اور موتیوں کی قدر تو جوہری ہی جانتا ہے یا بادشاہ!

بہرحال ان دنوں ہریا خوش تھی، مگن تھی، ہر وقت گنگناتی رہتی تھی۔ بس اُسے فکر تھی تو دو باتوں کی۔ ایک تو یہ کہ اب تک اس کی گود نہ بھری تھی۔ اس کے لئے وہ کبھی کبھی یاترا کی سوچتی تھی۔ مگر لچھن ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا کاہے کی جلدی ہے۔ یہ بھی ہو رہے گا۔ ہاں ہریا البتہ سورج نکلتے وقت آسمان کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتی اور اس کے ہونٹ کانپنے لگتے۔ گویا وہ میاں کی آنکھ بچا کر بھگوان سے کہتی ہوتی کہ مجھے میرا چاند بھی دے!

دوسرا سوچ جو ہریا کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا وہ یہ تھا کہ لچھن کسی طرح پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالنے کی عادت چھوڑ دے۔ وہ چاہتی وہ ہو اور اس کا شوہر میٹھی میٹھی باتیں ہوں اور پریم کی پھیڑ پھاڑ۔ وہاں حالت یہ کہ لچھن دن دن بھر اور اکثر پوری پوری راتیں اپنی جتھہ بندی میں پھنسا رہتا۔ ضلع بھر کا خدائی فوجدار بنا پھرتا۔ زیادہ دن نہیں ہوئے۔ ابھی چھ مہینے اُدھر کی بات ہے کہ گسائیں پور کے مشہور "لٹھیت" چھیدا کے خلاف لچھن نے دھاوا بول دیا تھا۔ چھیدا اپنے گاؤں کے ایک کوری کے کھیت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ روتا دھوتا فریاد لئے پہنچا لچھن کے پاس۔ پھر کیا تھا۔ ہریا نے لاکھ روکا اور سمجھایا۔ دوسرے گاؤں کی بات ہے، تم کاہے کو بیچ میں پڑتے ہو۔ مگر لچھن کو تو زور آزمائی کا ایک موقع مل گیا تھا۔ وہ پانچ چار چیلوں کو لیکر گسائیں پور پہنچ گیا۔ لاٹھی چلی اور خوب چلی۔ مگر کھیت پرہلی چلا کوری ہی کا۔ چھیدا زخمی ہو کر اسپتال داخل ہو گیا۔ اس فتح نے لچھن کی سرداری پہ گویا مہر لگا دی۔ اس کی لاٹھی کی "دھاک" سارے ضلع پر بیٹھ گئی۔ اس خوشی میں طے ہوا "لاٹھی پوجا کی جائے"۔

وہ کبھی کیا رات تھی، اماوس کی رات، چاندنی چھٹکی ہوئی۔ خاصی ٹھنڈک مگر ایک ہزار "لٹھیت" لاٹھی پوجا میں شرکت کے لئے اکٹھا ہوئے تھے۔ گھر کے سامنے والے میدان میں بیسیوں کڑھائے چڑھے ہوئے تھے۔ حلوائی پوریاں "چھان" رہے تھے حلوہ مٹھائی بنا رہے تھے۔ خیال تھا جس کا جتنا جی چاہے کھائے۔ جتنی سمائی ہو پیٹ میں بھرے کسی چیز کی کمی نہ ہو۔

وہ جن کے گھروں میں کنٹھے تھے اور دوسروں کے ہاتھ کا پکایا نہ کھاتے تھے انھوں نے اپنے الگ چولہے بنا رکھے تھے کوئی ہنڈ یا چڑھائے کھچڑی اُبال رہا تھا، کوئی اُپلوں کے بھوبھل میں "بھوبری" لگا رہا تھا۔

جب سب کھانا تیار ہو گیا تو بہت جی بلائے گئے ایک بڑے سے گڑ بنانے والے کڑھاوے کے گرد زمین لیپی گئی اس پر آکر وہ بیٹھ کر انھوں نے کچھ اشلوک اور منتر پڑھے پھر دس من دودھ میں لچھن کی لاٹھی کو نہلایا۔ کڑھائے میں یہ اکٹھا کیا ہوا دودھ "پرشاد" کی طرح ہر ایک کو کلھڑوں میں بانٹا گیا۔ پھر کھانے میں ہاتھ لگا۔ منچلوں نے ایک دوسرے کو للکار للکار کر ڈھائی ڈھائی سیر کی پوریاں کھا ڈالیں اور چار چار سیر پانچ پانچ سیر دودھ پی ڈالا۔ پھر رات بھر یہ سوا مقابلہ رہا۔

کتنا خوش تھا لچھن اس رات۔ سپید آدھی کا کرتا جسم میں۔ گلابی رنگی ہوئی دھوتی ٹانگوں میں اشرفیوں کا مالا گلے میں۔ موٹا سا پھولوں کا گجرا سینے پر۔ جدھر جدھر جاتا ہر ایک گرد گرد، سردار، سردار کہہ کر ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اور پر ہاکانے والا کوئی نہ کوئی ٹکڑا اس کی تعریف میں بھی ضرور بڑھا دیتا۔

ہریا دودھ، دہی، شکر، آٹا، گھی، ترکاری، نمک، مصالحہ بانٹتے بانٹتے تھک گئی تھی، چور ہو گئی تھی، مگر اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آج بیٹے کی برات لے جانے سے پہلے کھانا دے رہی ہے۔ جیسے بھی ہو سارے کھانے والے خوش رہیں۔ ہر شخص کو اس کی پسند کی چیز مل جائے۔ اور ہر ایک ڈٹ ڈٹ کر کھائے اس لئے اس تھکن میں بھی بڑا آنند تھا۔ عجیب طرح کی خوشی اور مستی!

چاندنی رات میں جگہ جگہ چولہوں کی روشنی ایسی نظر آئی جیسے سفید چادر جیسے سکے دوپٹے پہ مہندی کے پھول بنا دیئے گئے ہیں۔ رات جب بھیگ گئی کچھ سے چھوٹے لگی ہو گئے اور ہلکا گہرا اندھیرے میں چھا گیا تو بڑے بڑے الاؤ جلا دیئے گئے۔ ان کے شعلے بھڑک کر ایسے لگتے جیسے دھوئیں کی چادر کے نیچے انار چھوٹ رہے ہیں۔ گویا گھر میں برات اتری ہے اور آتشبازی بھی ساتھ لائی ہے۔

کئی دن اس خوشی کا خمار رہا۔ ہریا کا جوڑ جوڑ دکھتا تھا مگر تعریف کرنے والوں اور مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ خود لچھمن بھی کئی راتیں اس اطمینان سے سویا کہ ہریا کو ہر صبح اسے گدگدا کر اٹھانا اور ناشتہ کرنے کے لئے جگانا پڑا۔ اور وہ انگڑائیاں لے کر مسکرا کر اس طرح بیوی کو دیکھتا جیسے ہریا سچ مچ سپنوں کی پری بن گئی تھی۔ مسرت کی لہر اسی طرح اٹھتی رہی، اٹھتی رہی۔ اور تھمنے نہ پائی تھی کہ اچانک لاٹھی پوجا کے ساتویں دن لچھمن مار ڈالا گیا۔

کتنا تکلیف دہ تھا وہ دن بھی۔ چار بجے صبح کو جبکہ خاصا اندھیرا تھا کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ لچھمن باہر گیا دونوں میں آہستہ آہستہ باتیں ہوئیں۔ اور لچھمن جھپٹتا ہوا اندر آیا۔ اور لاٹھی اٹھا کر نکل گیا۔ ہریا لچھمن کے اس طرح اچانک

چلے جانے کی عادی تھی، یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ آئے دن ایسا ہوا کرتا تھا۔ مگر آج ہریا کا دل نہ جانے کیوں آپ ہی آپ گھبرانے لگا وہ پلنگ پر لیٹی نہ رہ سکی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور اس نے باہر جاکر مویشیوں کو ناند پر لگا دیا پھر بوٹا لیکر "جنگل" چلی گئی۔ پلٹ کر اس نے اپنے کچے کنوئیں سے گگرے پہ گگرا بھر کر خوب نہایا۔ اور ساری بدل کر دودھ دوہنے لگی۔ مگر یہ عجیب بات ہوئی کہ جب بڑی بالٹی دودھ سے بھر چلی تو دودھ کی ٹیا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین کی طرف چلی اور اس کے سنبھالنے میں جو ہریا جھپٹی تو دودھ سے بھری بالٹی ٹھوکر لگ کر الٹ گئی۔ اور دس سیر سے زیادہ دودھ زمین پر بہہ گیا۔

اس بدشگونی پر ہریا کو یقین آگیا کہ آج کا دن خیریت سے گذرنا مشکل ہے۔ وہ دھم سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اور عجیب طرح کی بے بسی محسوس کر کے رونے لگی۔

اب پو پھٹ چکی تھی، کوے قائیں قائیں کرکے درختوں سے کھیتوں کی طرف جارہے تھے۔ چڑیاں چہک رہی تھیں دور کسی اور کا بچھڑا مال کے لئے "بائیں بائیں" کر رہا تھا۔ اہیر ٹولی میں چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ مویشی کھونٹے باندھے جارہے تھے۔ اور دودھ دوہا جا رہا تھا۔ اہیرنیں کٹیرلوں میں دودھ اور جھوؤں میں سوکھے اپلے گاؤں میں لیجا کر بیچنے کے لئے رکھ رہی تھیں۔ مگر ہریا سر پکڑے زمین ہی پر بیٹھی رہی۔ اس میں سے ایک اہیرن نے اپنے گھر سے اسے اس حالت میں دیکھا لپکی ہوئی آئی، اس نے پوچھا۔ "ارے تو کا ہے چپ چاپ بیٹھن ہو"۔ دفعتہً اس کی نظر گرے ہوئے دودھ پر پڑی۔ وہ چیخ پڑی۔ "ارے دیا رے! ای کا بھوا؟ اب اٹھا دن کا دودھ کیسے دی ہو؟"

جب ہریا کچھ نہ بولی تو وہ خود ہی ہر ایک کے ہاں سے جاکر تھوڑا تھوڑا دودھ مانگ لائی اور ہریا کو ساتھ لیکر گاؤں میں جہاں جہاں دودھ مقرر تھا سب گاہکوں کو پہنچا آئی۔

ہریا بہت کم خود دودھ لیکر کہیں جاتی تھی۔ یہ کام کبھی لچھمن کے خوف یا خاطر سے دوسرے ہی کر دیا کرتے تھے۔ مگر آج صبح ہی سے کوئی نہ آیا۔ اسے خود ہی جانا پڑا۔ پھر گھر پلٹی تو بڑی تنہائی محسوس ہوئی۔ چرواہا مویشیوں کو میدان لے جا چکا تھا۔ گھر میں کوئی کام نہ تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے لئے دو روٹیاں ٹھونکیں، اور انھیں مل کر دودھ میں ڈال کر کھا لیا۔ مگر پاؤ بھر دودھ بھی ایسا دوبھر ہو گیا کہ آدھا چھوڑا باہر جاکر ڈال آئی۔

وہ بار بار گھر سے نکل کر ادھر اُدھر دیکھتی، پھر مایوس ہو کر گھر کے اندر چلی جاتی۔ وہاں اپنے کو پلنگ پر گرا دیتی کروٹیں بدلتی اُٹھ کر پانی پیتی۔ پھر جلتی دھوپ میں دوڑتی ہوئی باہر آتی۔ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتی رہتی۔ پھر مایوس واپس جاتی۔ دو بجے دن تک وہ یہی آہر جاہر لگائے رہی۔ پھر وہ باہر والے چھپر ہی میں جم کر بیٹھ گئی۔ اُسے نہ سردی لگتی نہ گرمی۔ اسے پیاس تھی نہ بھوک پھر بھی ہونٹ پپڑائے ہوئے تھے۔ حلق سوکھا ہوا تھا۔ اور زبان میں کانٹے پڑے تھے۔

شام کے قریب چرواہا دوڑا ہوا آیا۔ اس نے سنائی سنائی لچھمن کو دشمنوں نے دھوکہ سے مار ڈالا اور اس کی لاش کو گڑاسے سے ٹکڑے کرکے دریا میں مختلف جگہوں پر اس طرح ڈال دیا کہ کوئی پتہ نہیں چل سکتا۔

ہریا کو عمر میں پہلی اور آخری بار غش آیا۔ وہ دس دن بخار اور سرسام میں پڑی

رہی جب وہ اپنے حواس میں آئی تو دو ایک دن لوگوں نے اس سے یہ دُکھ بھری کہانی چھپائی، پھر آہستہ آہستہ بتایا کہ گاؤں کے چوکیدار کی رپٹ پر سپاہی بھی آئے تھے اور خود داروغہ جی بھی۔ بڑی پوچھ گچھ رہی۔ گشائیں پورتک دوڑ گئی، دریا میں جال بھی پڑے، مگر لچھن کے جسم کا کوئی ٹکڑہ انہ ملا۔ اور قانون کی رو سے جب تک لاش نہ ملے کسی کو قاتل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہر شخص کو یہ یقین تھا کہ یہ کام چھیدا کا ہے مگر کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ غرض پولیس معمولی کوشش کر کے بیٹھ رہی۔ نہ اسے لچھن کے مارے جانے کا کوئی غم تھا اور نہ اس کے قاتل کے سراغ لگانے کی کوئی خاص فکر تھی اس کے نزدیک تو خس کم جہاں پاک والا معاملہ تھا۔

مگر ہریا کا تو راج لٹ گیا، دودھ بکنا بند ہو گیا۔ ترکاریوں کا آنا بند ہو گیا۔ ہر کام میں ہاتھ بٹانے والوں کا تانتا لگنا بند ہو گیا۔ نہ اب اس کے پاس کوئی چرواہا تھا نہ ہرواہا۔ نہ چیلوں کا جتھا۔ نہ خوشامدیوں کا گروہ۔ وہ لوگ جو ہمیشہ اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے ڈرتے تھے، اب اسے دیکھ کر آنکھ مارتے تھے، جن کی اس کے سامنے گھگھی بندھتی تھی وہ اب فقرے کستے تھے، جس لاٹھی نے اس کے گرد لوہے کی دیوار کھینچ رکھی تھی وہ ٹوٹ گئی تھی۔ اب تو ہر ایک اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کا پکا پھل تھی، ہر ایک اُسے توڑ کر کھا لینے کا اپنے کو حقدار سمجھتا تھا۔

ہریا ان بدلی ہوئی نظروں کو پہچانتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں گرھتی تھی مگر کر ہی کیا سکتی تھی۔ کوئی اپنا نہ تھا جس سے ان بیگانوں کی شکایت کرتی۔ گاؤں میں کوئی بھی ہمدردی کرنے اور سر پہ ہاتھ رکھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ سب کو لچھن سے کبھی

نہ کبھی، کوئی نہ کوئی آزار ضرور پہنچا تھا۔ جن کے ساتھ اس نے احسان کیے تھے وہ بھی انھیں بھول گئے تھے۔ بلکہ الٹے گڑے مردے اکھاڑے گئے اور سوکھے زخم کرید کرید کر پھر سے ہرے کر لیے گئے۔ ہریا ایک باجی، بدمعاش ڈاکو کی بیوی تھی۔ اسے بے سہارا بے جان گرا ہوا دیکھ کر ہر ایک اسے دو لاتیں مار دینا فرض سمجھتا تھا۔ بیماری ہی میں گھر کا بہت سا اثاثہ صاف کر دیا گیا تھا۔ اب رات ہی رات اس کا تیار کھیت کاٹ لیا گیا۔ اس کے مویشی ہریانے مویشی خانے پہنچا دیئے گئے۔ حد یہ ہو گئی کہ اس کے سب سے اچھے بیلوں کی وہ جوڑی جو سال بھر پہلے پچھن نے پانچ سو کو خریدی تھی ایک رات کھونٹے سے کھل کر غائب ہو گئی اور کچھ پتہ نہ چلا کہ زمین میں سما گئی یا آسمان میں اڑ گئی۔

یہی وجہ تھی کہ ہریا اب خود مویشی چراتی تھی۔ اور رات میں انھیں کے قریب کھٹیا ڈال کے سوتی تھی۔ یہی باتیں تھیں جو وہ اس وقت دل میں کھڑی سوچ رہی تھی اور وہ بار بار دل میں ان تمام تکلیفوں کا باعث حمیدا کو ٹھہراتی اور اس سے نفرت کی آگ کو ہوا دے کر بڑھاتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ حمیدا کی بوٹی بوٹی دانتوں سے نوچتی اور چیل کوؤں کو کھلاتی!

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ گھٹنک نے زور زور سے الاپنا شروع کیا۔

اسی باعث تو کتلے آسکاں سے منا کرتے تھے
اکیلی پھر رہی ہو یوسبے بے کارواں ہو کر

{اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر}

ہریا شعر کے معنی تو نہ سمجھ سکی مگر اس میں چھپے ہوئے طعن کو سمجھ کر تلملا اٹھی۔ وہ لاٹھی اٹھا کر جھپٹتی ہوئی منڈیا تک آئی اور لاٹھی تان کر بولی، "چپ گھٹنک کے جنے!"

لچھن مر گئیل پر اُہکا لاٹھی نا مرلِ !" کہٹ ڈر کر جھونپڑی کے کونے میں دبک گیا۔ وہیں سے کانپتی آواز میں بولا "اہے ہم کیجہو کہت ہئین بھوجی !"

وہ بولی "ہاں، تو ہم ہُوں کہہ دیت ہئیں کہ ہم کا ایسن ویسن مت جنی ہو ! ہم سر توڑ کے رکھ دیئب !" اتنے میں ایک گائے جو ہریا کو کان اُٹھائے آنکھ پھاڑے دیکھ رہی تھی نہ جانے کیا سمجھی کہ یکایک بھڑک کر بھاگی۔ ہریا نے دور تک اس کا پیچھا کیا اور اُسے ہنکا کر گلے میں لائی۔ پھر بھینسوں کو گڑھیا سے نکال کر سارے مویشیوں کو بڑبڑاتی ہوئی ہنکاتی گھر لے گئی۔ اتفاق سے اسی وقت گتائیں پور کا ایک آدمی دکھائی دیا۔ ہریا نے اُسے روک کر کہا: "چھیدا سے کہہ دیہو کہ چھپ چھپ کر وار کرنا مردن کا کام ناہیں، اور نہ بدھوا کو ستانا بہادری باٹے۔ اُہکا لڑے کا جی چاہت ہے تو ایہاں پنچن کے سامنے آ کر ہم سے لاٹھی چلا لے !"

چھیدا اُسی رات کو آیا اور تنہا آیا۔ ہریا اپنے چھپر میں غافل سو رہی تھی۔ اس نے پلنگ سے دور کھڑے ہو کر کنکریاں پھینک پھینک کر اُسے جگایا۔ وہ گھبرا کر اُٹھی۔ چھیدا وہیں سے بولا: "جرا لالٹین جلاؤ بھوجی، تو ہم تہہ سے بات کریں !"

ہریا نے لالٹین جلا کر دیکھا تو ایک سانولے رنگ کا میانہ قد جوان ہے، سر پر پگڑی، ننگے بدن، دھوتی "کاچھے" کی طرح کسی ہوئی، ہاتھ میں ایک سیاہ تیل لگی ہوئی لاٹھی، چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔

ہریا نے پوچھا "کون ہو جی تم ؟"

اُس نے کہا "چھیدا !"

نام سنتے ہی ہریا کے جسم بھر میں بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ چھلانگ مار کر پلنگ سے پھاندی اور اس نے ایک موٹی سی گالی دے کر چھیدا پر بھرپور وار کیا۔ چھیدا اُچھل کر اپنے کو بچا گیا۔ اور ہنس کر بولا "واہ رے بھوجی واہ! پاہُن ایسو طرح کہیں اُتاول جات ہے!"

ہریا نے پھر لاٹھی تانی۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر روک کر بولا "ارے جری بات تو سُن لے! ہم کا تہہ سے لڑے کا ہوت تو ہم تہہ کا ٹھاڑ ہوئے دیست؟"

ہریا ہانپتی ہوئی بولی "تو جلدی کہہ، کا کہے کے ہے؟"

چھیدا بولا "بھوجی، ہم پر جھوٹ اِلجام ہے۔ ہم لچھمن کا نا مریں۔ اُوہی کا گُٹ والا ل کے گھات کی لین! اوہے تو کھیت کاٹت ہیں، تور گورو بچھرو چراوت ہیں!"

ہریا کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ چھیدا کے لب و لہجہ میں اتنی سچائی تھی، اتنی نڈری تھی، اتنا بھروسہ تھا کہ ہریا اس کی بے گناہی پر یقین کئے بغیر نہ رہ سکی۔ مدتوں سے جو نفرت کا قلعہ کھڑا تھا وہ چھیدا کی باتوں سے دھم سے گر پڑا اُس نے اپنی ٹانگوں میں کمزوری محسوس کی اور وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ سوچنے لگی، چھیدا کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ سب نے لچھمن کا قاتل کہہ کر اس کا کیا بگاڑ لیا تھا کہ اگر وہ اس وقت اقرار کر لیتا تو ہریا اس کا کچھ کر لیتی۔ پھر اگر وہ واقعی ہریا کو ستانا چاہتا تو وہ سوتی ہوئی عورت کو ہر طرح پریشان کر سکتا تھا۔ اس پر لاٹھیاں برسا کر مار ڈالتا، اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ اس کے مویشی کھول لے جاتا اس کے وار کو خالی دینے کی جگہ لاٹھی کا جواب لاٹھی سے دیتا!

چھیدا نے کہا "ارے بھوجی! یہ ماسن کی سرداری بڑا جان جوکھم کام ہے! جہاں جتھا مجبوت بھئیل اور سبے سردار بنے کا چاہت ہیں! اپنے گاؤں کا نرپت کا دیکھو، آجکل کیسن سانڑ بنا بھرت ہیں"

ہریا نے پوچھا "تو اُو ہے مرلیسن ہو؟"

چھیدا نے کہا "ای ہم کا جانیں۔ مل ہم نا مرلین!"

ہریا نے بڑی بے بسی سے کہا "تو ہم کا کریں؟"

وہ بولا "تم تنکو چنتا جن کرو۔ آنند سے بیٹھو۔ ہم سب انتجام کر دیئب!" —— اور وہ چلا گیا۔

دوسرے ہی دن گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ آس پاس کے گاؤں میں چھیدا کے آدمی گھوم گھوم کر کہہ گئے ہیں کہ ہریا کے کھیت یا مویشیوں کو اگر کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو اسے چھیدا سے سمجھنا پڑے گا۔ ہریا کو یہ خبر سن کر ذرا سکون تو ملا، مگر اسے سب سے زیادہ فکر تھی اب کے کھیتوں کے جوتنے کی۔ بیل چوری جا چکے تھے۔ ہل کیسے چڑھے گا؟ کیا اب کے سب کھیت پرتی ہی پڑے رہیں گے؟ یہ نہیں تھا کہ ہریا کے پاس نئے بیل خریدنے کے لئے دام نہ تھے۔ وہ اچھی سے اچھی جوڑی خرید سکتی تھی۔ مگر وہ گھر اکیلا چھوڑ کر کہیں میلے ٹھیلے جا بھی تو نہیں سکتی تھی۔ دن دہاڑے لوگ گھر میں گھس کر نا جمع جتھا" نکال لے جاتے۔ کوئی مرد ایسا نہ تھا جس کو کئی سو روپئے بیلوں کے خریدنے کے لئے دیئے جائیں۔ بیوہ کے روپئے مار لینا کون سی بڑی بات ہے۔ ہریا کو اس زمانے میں یہ بڑی سختی سے محسوس ہوا کہ بغیر اپنے مرد کے ایک تنہا عورت کے لئے زندگی بڑی دشوار ہے۔ اسی لئے اسے بار بار چھیدا کا خیال آتا۔ سوچتی

اسی کے ہاں کہلا دو، وہ ہی انتظام کر دے گا۔ مگر عورت ذات تھی۔ کہلاتے شرم بھی آتی تھی۔ نہ جانے دل میں کیا سمجھے اور بات پہنچانے والا کیا کیا معنی پہنا دے۔

وہ اسی حیص بیص میں تھی کہ جون کی پندرہ آگئی۔ مون سون چلا۔ ابر آسمان پر چھا گئے۔ بادل مینڈھوں کی طرح آپس میں ٹکرائے۔ پانی ٹوٹ ٹوٹ کر برسا اور سارے میں جل تھل ہو گیا۔ جن کے پاس دھنکر تھے انھوں نے تو مینڈیں اونچی کر کر کے اپنے کھیتوں میں پانی روکا، جن کے کھیت ذرا بلندی پر تھے اور وہ دوسرے اناج بونا چاہتے تھے، انھوں نے مینڈیں کاٹ کاٹ کر پانی نکال دیا۔ ہریا گھر ہی میں بیٹھی رہی، اپنے کھیتوں کے قریب بھی نہ گئی۔

جو تھے دن جب پانی رکا اور دھوپ نکلی تو ہر طرف چہل پہل تھی۔ کھیتوں پر ہل چڑھ گئے۔ مہینوں کے خشک کھیت شاداب و سیراب ہو کر مسکرا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کھیت نہیں، ماؤں کی چھاتیاں ہیں کہ اپنے بچوں کے لئے دودھ سے بھری پڑی ہیں۔ ان کی بھوک پیاس بجھانے کے لئے، ان کو شکم سیر کرنے کے لئے، ان کو غذا اور طاقت دینے کے لئے! ہریا بھی اندر نہ بیٹھ سکی وہ کئی بار اپنے کھیتوں کی حالت جا کر دیکھ آئی۔ وہ گود پھیلائے اسے بلا رہے تھے۔ آؤ، آؤ ہمیں کھودو، کاٹو، روندو، ہمارا سینہ پھاڑ دو، ہم تمھیں خوشی خوشی اجازت دیتے ہیں۔ مگر ہریا آنکھوں میں آنسو بھر کر منہ پھیر لیتی۔ اور لمبے لمبے قدم رکھ کر گھر بھاگ آتی تھی۔ اور اپنی تنہائی اور بے بسی محسوس کر کے سسک سسک کر روتی تھی۔ شام کو جب ہر کسان خوش خوش گھر لوٹا تو ہریا نے مویشیوں کو چارے پر بھی نہ لگایا وہ اندر گھس گئی۔ اس نے کنڈی بند کر لی اور وہ منہ لپیٹ کر کھاٹ پر گر پڑی۔ دماغی کوفت اور تھکن نے

اسے خوب غافل سلایا۔ وہ سوئی اور گھوڑے بیچ کر سوئی۔ دن چڑھے وہ اس وقت اُٹھی جب کسی نے کنڈی کھٹ کھٹا کر اسے زور زور سے پکارا۔

وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا ایک اجنبی کھڑا ہے۔ اس نے تیکھے پن سے پوچھا "تُوں کون ہو اور کا چاہت ہو؟

اس نے کہا "آپن کھیت پہ چلو، چھیدا بلاوت ہن!"

وہ لپکی ہوئی ساتھ ہو لی۔ تھوڑی ہی دور پہ اس کے وہ کھیت تھے جن میں گیہوں بویا جاتا تھا۔ دیکھا تو ان میں تین ہل ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ اور یہ سب ہی گونتائیں پورے کے۔ خیال آیا ارے یہ میرے کھیتوں پر قبضہ کرنے کی ترکیب تو نہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکے کندھے پر ہل رکھے اور ناگوری بیلوں کی جوڑی ہنکاتا ہوا سامنے سے چھیدا آتا دکھائی دیا۔

وہ ہریا کے قریب آکر بولا "بھوجی؛ جا کے دیکھ لیو، تہار سب کھیت جُت گئل!" اور ہریا ادھر مڑ گئی جدھر دوسرے کھیت تھے۔ سب بیجتے ہوئے ملے، پھول کی طرح ہنستے ہوئے۔ ہر ایک کی سطح پہ ہریا بن گئی تھی اور ان کی تازی مٹی سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ ہریا کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی نئی دلہن سے ملنے آئی ہے جو زبان سے تو کچھ نہیں بولتی مگر جس کے دل میں بار بار گدگدی ہوتی ہے اور چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔

چلتے میں گاؤں کا ایک کسان ملا۔ اس نے دیکھتے ہی ہریا کو مبارک باد بھی دی اور طعن بھی کی۔ وہ بولا:۔

"لیو، بھوجی! ہرڑ لگے نہ پھٹکری! اور رنگ چوکھا آئے با تم ٹانگ لیسا ہے"

سوتے رہو اور چھیدا تمہارا سب کام کر دے۔ بس! کئی سو برس ہو، ہریا کے آگے سب کی نانی مرتی ہے!"

ہریا نے اُسے گھور کر دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ پہلے کھیتوں سے بھی ہل نکل کر جا چکے تھے۔ ہریا ان میں گھوم گھوم کر ان کی حالت دیکھتی رہی کنکر پتھر ان میں سے چن کر باہر پھینکتی رہی۔ اور بڑے بڑے مٹی کے ڈھیلوں کو توڑ کر انھیں چور کرتی رہی۔ مگر دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات آتے رہے۔ چھیدا بڑا اچھا ہے، چھیدا نے اس کے کہے بغیر اس کے کھیت جتوا دیے۔ چھیدا اپنی بات پر اڑنے والا مرد ہے، چھیدا، چھیدا، چھیدا! بس اسی کی صورت، اسی کی باتیں، اسی کا دھیان۔ اور گوسائیں پور والے سب چلے گئے۔ ہریا نے کسی کو کچھ کھلایا پلایا بھی نہیں۔ کوئی خاطر بھی نہ کی، کسی سے ہنس کر بولی تک نہیں۔ اور چھیدا...... اس کی سانسیں سینے میں اٹکنے سی لگیں، اس کا چہرہ کبھی سرخ ہو جاتا، کبھی زرد، اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپی پیدا ہو جاتی، وہ گھبراتی رہی، الجھتی رہی، چھیدا کے احسان کا بدلہ کیسے اتارے، یہی سوچتی رہی، وہ پسینے میں بھیگ گئی، اور گردن جھکائے سوچتی گھر پلٹی۔ دیکھا تو اس کے جانور پاس والے باغ میں چر رہے ہیں، اس کے بیلوں کی سونی ناندوں پر دو خوبصورت بڑے بڑے بیل بندھے ہیں۔ بالٹیوں میں کٹوروں میں دودھ بھرا رکھا ہے، اور اُس کے بچھیرے ہیں، اس کے کھاٹ پر چھیدا پڑا بے خبر سو رہا ہے۔

ہریا جلدی سے رسوئی گھر میں گھس گئی۔ اس نے چولہا جلایا اور آٹے میں خوب گھی ملا کر موٹی موٹی خستہ اور بھربھری ٹکیاں سینکیں۔ اس نے ٹکیاں پھول

کی ایک تھالی میں رکھیں، اسی میں گڑ کی بھیلی رکھی اور بہت سا سوندھا سوندھا کچّا گھی اور ایک بڑا سا گلاس بھر کر دودھ۔ ایک ہاتھ میں یہ تھالی اور دوسرے میں پانی سے بھرا لوٹا لئے ہوئے چھیدا کے پلنگ کے پاس آئی۔ اس نے گھٹنے سے اس کے "کھاٹ" کی پٹی ہلائی اور وہ بولی۔

"کب تک سوائی ہو۔ اُٹھو! مُنہ ہاتھ دھو کے کچھ کھا لیو!" ——

اور اس کے لہجہ میں وہی نرمی، وہی گرمی، وہی شیرینی تھی، جو ہندوستانی عورت کی آواز میں اپنے پتی ہی کے لئے ہو سکتی ہے!

چھیدا نے آنکھ کھولی، انگڑائی لی، تھالی ہریا کے ہاتھ سے لیکر بان کے کھاٹ پر رکھ دی بولا۔ "آؤ ہم اپنی لاٹھی پوجا تو کر لین!" وہ دودھ سے بھرا گلاس لیکر بیلوں کی طرف چلا۔ ہریا بھی پیچھے پیچھے ہو لی۔ ناند پر پہنچ کر چھیدا نے ہریا سے اشارہ کیا اور دونوں نے گلاس کا دودھ چلوؤں میں بھر بھر کر بیلوں کو پلا دیا! ——

چھیدا نے مسکرا کر ہریا کو دیکھا اور بڑی خود اعتمادی سے پوچھا "اب؟" اس نے گھونگھٹ نکال کر کنکھیوں سے دیکھ کر کہا "آؤ چلو، ٹھہرو پاؤں دودھ سے دھو دیں!" —— اور اس کی آواز میں ایک پجاری کا خلوص تھا!

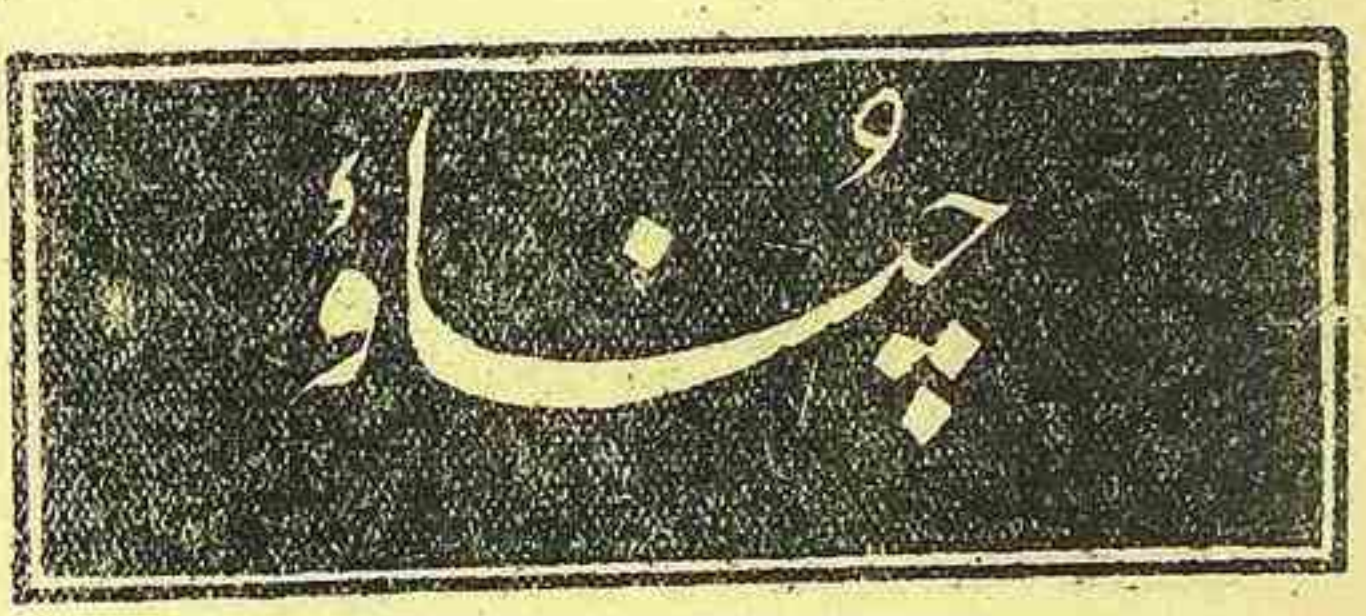

چناؤ

۱۹۵۷ء

کردار

گوپال .... ایک بوڑھا کسان۔ لاغر، سوکھا ہوا۔ مگر آواز میں ایک گرج سی

جھکو .... ادھیڑ عمر کا، گول مول، پست قد، آنکھوں سے عیاری و ہوشیاری ٹپکتی ہوتی —— ننگے سر، بڑی سی چوٹیا۔

ہنگو .... ادھیڑ عمر، لمبا، دبلا پتلا، چہرے سے نیکی ٹپکتی ہوئی۔ جہاں دیدہ، پڑھا لکھا۔

متی کی ماں .... بوڑھی، موٹی تازی، ہنس مکھ۔

دوسرے کسان اور دیہاتی، دیہاتنیں ——

دیہاتی سرپنچ کا الگشن ہے۔ ایک نیم پختہ مکان کے دالان کے سامنے صحن میں ٹاٹ بچھا ہے۔ اس پر کسان اور دوسرے گاؤں کے رہنے والے بیٹھے ہیں، کوئی نریل پی رہا ہے، کوئی بیٹھا، کہیں یہ چلم ہی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہی ہے، اور آپس

یں باتیں ہو رہی ہیں جس کی وجہ سے شور سا ہے۔
صحن سے ملے ہوئے دالان کے سرے پر ایک چھوٹی سی
میز رکھی ہے، اس کے پیچھے کرسی پر گوپال بیٹھا ہے۔

گوپال (کھڑے ہو کر) بھائیو، بہنو!
متی کی ماں (ایک بوڑھی کو کہنی مار کر) لو سنو جی! آج سے توں بہوں بہن ہو گئی تو!
(آج سے تم بھی بہن ہو گئیں)
بوڑھی۔ اری چپ! (عورتوں میں کھی کھی ہنسی ہونے لگتی ہے)
گوپال۔ متی کی ماں! جرا (ذرا) ان بہینوں، کو ئیوں کو چپ کرا دے، تو ہم کچھ کہیں!
متی کی ماں۔ (کھڑی ہو کر کمر پر ہاتھ رکھ کے) ارے کو ٹکن نہ سنائی دیت ہے
کہ کوا کائیں کائیں کرت ہے! (ارے کوئی تو نہیں سنائی دیتا کہ کوا کائیں
کائیں کرتا ہے)
(بڑے زور کا قہقہہ پڑتا ہے۔ متی کی ماں کو پہلی بوڑھی کھینچ کر بٹھا دیتی ہے)
گوپال۔ چلو، ہنستے ہی گھر بستے ہیں! اور یہ کام بھی ہے پورے گاؤں کے بسنے
اور سنورنے کا! (رک کر) اچھا اب ہنسی ختم۔ اب کام کی بات سنو۔ ہم کو
آج کے دن اپنی گاؤں پنچایت کا سرپنچ چننا ہے۔
متی کی ماں۔ اور تو ہمکے کا بھوا ہے؟ جیسے تین ورش سے ہو، یاہ ورش اور سہی...
(اور تم کو کیا ہوا ہے۔ جیسے تین برس سے ہو، اس سال اور سہی)
مجمع۔ ہاں، ہاں، ٹھیکے کہت ہو کا کی (ہاں، ہاں ٹھیک ہی کہتی ہو کا کی)
گوپال۔ نہیں نہیں، ہم نے جندگی بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے! پھر نیا آدمی چنو گے

تو وہ نئی نئی یوجنا سوچے گا، نئے منصوبے گا، گاؤں کو آگے بڑھانے
کی اُپائیں سوچے گا، یہ ہم بوڑھوں سے نہیں ہوتا!.....

منّی کی ماں۔ سبھی جی تو کہتے ہیں کہ تو ایسا بوڑھا نا ہو! (سبھی جی تو کہتی ہیں کہ تم ایسے بوڑھے نہیں ہو!) قہقہہ پڑتا ہے۔

بوڑھی۔ (منّی کی ماں کو کھینچ کر) ارے نہ اِدھ کے کھد کچّا آوے نہ ای دوسرے کی پچار کھے (قہقہہ)

گوپال۔ منّی کی ماں مرے اُجلے بالوں پر دیا کرو اور چپ رہو، کام کرنے دو۔ (رُک جاتا ہے)

منّی کی ماں۔ ای بال تو تورن دھوپ میں پکائے ہو!..... (بوڑھی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ منّی کی ماں ہنس ہنس کے ہاتھ جوڑ کر خاموش رہنے کا اقرار کرتی ہے۔)

گوپال۔ (تقریر جاری رکھتے ہوئے) ہاں بھائیو، تو آج جو ہم اکٹھا ہوئے ہیں تو کام یہ ہے کہ ہمیں اپنا سرپنچ چننا ہے۔ اس جگہ کے لئے دو امیدوار ہیں۔ ایک تو ہیں جھکّو اور دوسرے ہیں ہکّو۔ ہم کو انھیں میں سے ایک کو چننا ہے اس لئے میں تو بیٹھا جاتا ہوں، تم ان کے منہ سے اُن کے گن سن لو۔ وہ کیسے ہیں، کیا کیا کرنے کا منصوبہ رکھتے ہیں۔ وہ خود تم کو بتائیں گے۔ (رُک کر) پہلے جھکّو بھیا آئیں!

جھکّو۔ (گھمنڈ سے چلتا ہوا میز کے پہلو میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے) ہم کو آپ پُرشوں ناریوں میں سے کون نہیں جانتا۔ ہم یہیں پیدا ہوئے، یہیں پلے،

یہیں بڑھے۔ نہ پرائے دیش گئے، نہ کسی پاٹ شالے، اسکول میں پڑھے بالکل آپ جیسے ہیں۔

ہکّو کا ایک ساتھی۔ بھگوان نہ کرے ہم آپ جیسے ہوں! (قہقہہ)

گوپال۔ خاموش! (خاموشی چھا جاتی ہے)

جھکّو۔ بھائیو! پتا جی مرے تھے تو نہ ہاتھ بھر زمین پاس تھی نہ ہل نہ بیل، پر آج تم پنچوں کی دیا سے دو ہل کی کھیتی ہے، بیس بیگھے کے ہم بھومی دھر ہیں اور رہنے کو پکّی حویلی ہے۔ سو بھائیو! اگر تم چاہتے ہو کہ ہمارا گاؤں بھی اسی طرح بڑھے، تم نرپت پور والوں سے ہر بات میں بازی لے جاؤ، اس گاؤں کے باسیوں کی ہر مکابلے میں طبیعت جھک کر دو تو ہمیں سرپنچ بناؤ!.....

جھکّو کے ساتھی۔ ارے واہ رے جھکّو واہ! واہ! ہکّو تمھارے سامنے جھک ماریں!.....

گوپال۔ خاموش!

جھکّو۔ (ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہوئے) یاد رکھو، مری جگہ ہکّو کو چنو گے تو وہ سوائے حُقّا پینے کے اور کچھ نہ کریں گے! (ہکّو اپنا ڈیل گھما کر بغل میں بیٹھے ہوئے ساتھی کو پکڑانے لگتا ہے۔ مجمع اس کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے اور قہقہہ لگاتا ہے، جھکّو مسکرا کر مجمع کے سامنے جھکتا ہے اور اپنی جگہ پر بیٹھنے کے لئے چلا آتا ہے)

گوپال۔ (کھڑے ہو کر) اب ہنسی بند کرو اور ہکّو بھائی کی کتھا سُن لو! (بیٹھ جاتا ہے)۔

[ہکّو، گھبرایا گھبرایا سا اٹھتا ہے، میز کی طرف چلتا ہے]

مجمع میں سے ایک۔ ارے کاکا اپنا حُقّا تو لیتے جاؤ! (قہقہہ)

[ہکّو اس قہقہہ پر جیسے سکڑ جاتا ہے۔ پھر اس کے چہرے پر عزم کی ایک لہر سی دوڑتی ہے۔ وہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے زیل کو بائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے اور اسے میز پر ٹیکا کر تقریر کرنے لگتا ہے]

ہکّو۔ دیویو اور پرشو! جھکّو کی طرح ہم نے بھی اسی گاؤں میں جنم پایا، یہیں پلے اور بڑھے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ ہم نے دو اکشر پڑھا بھی اور ہم پرائے دیشوں کا حال بھی اپنی آنکھ سے دیکھ آئے ہیں۔ (رُک کر) ہمارے باپ دادا سدا سے اس گاؤں کے اچھے کسانوں میں تھے، گھر بھی تھا، بیل بھی تھے، گیّا بھی تھی، بھینسیں بھی تھیں۔ ہم چاہتے تو ہم اور ہمارا اکٹم سیکڑوں بیگھے زمین کا بھومی دھر بن جاتا۔ پرنتو تم جانتے ہو کہ ہمارا نام ہکّو ہے۔ یعنی ہک بات کہنے والا، ہر ایک کا حق دینے والا۔۔۔۔

جھکّو۔ ہکّو نہیں، ہکُّو ہے، حُقّا پینے والا! (قہقہہ)

جھکّو کا ساتھی۔ کاکا! تم تو اپنے نام کا نشان کھُد ہی ہاتھ میں لئے ہو! (قہقہہ)

اسی کا دوسرا ساتھی۔ کاکا! اب کے پرانت کے چُناؤ میں یہی زیل کیسا پر کھینچا دینا! (قہقہہ)۔

گوپال۔ (کھڑے ہو کر) بھائیو، دیکھو، ہم پنچ ہیں۔ ہمارے لئے کہا گیا ہے "پنچ پرمیشر!" ہمارا کام نیائے ہے جبردستی کسی کی کھنچ کرنا انیائے ہے۔ جھکّو کی جھک جھک بک بک (قہقہہ) تم سب لوگوں نے سن لی اب ہکّو کو کیا کہنا ہے

اسے بھی دھیرج سے سنو۔ ہگّو کو بھی جی بھر بک بک کر لینے دو! (قہقہہ)
بس اب سوائے ان کے کوئی چونچ نہ کھولے۔ کھبردار! (قہقہہ۔ گوپال بیٹھ
جاتا ہے)

ہگّو۔ (مجمع کو ہاتھ اُٹھا کر خاموش کرکے) تم سب بھائی میرے حقّے پر بڑی پھبتیاں کستے ہو۔ میرا شریر بھی ڈیڑھ خمے کی طرح کچھ ٹیڑھا سا ہو گیا ہے (قہقہہ) مگر ہردے تمباکو کی طرح کالا نہیں ہوا ہے۔ میں جو بات تم سے کرنے کو کہوں گا، اسے سب سے پہلے خود کر دکھاؤں گا۔ (رک کر) اچھا تو، یہ سب سے پہلا سُدھار!

[ہگّو نریل کو جھٹ سے توڑ کر پھینک دیتا ہے۔ پہلے لوگ اچنبھے سے منہ کھولے دیکھتے ہیں]

ہگّو کا ایک ساتھی۔ واہ کاکا واہ! (وہ تالی پیٹتا ہے، سب تالی پیٹنے لگتے ہیں اور مجمع میں ہر طرف سے "واہ واہ" کی آواز سُنائی دیتی ہے)۔

ہگّو۔ (ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرکے) میں تم سارے پنچوں کے سامنے سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ آج سے میں نے یہ پچاس برس کی لت چھوڑ دی۔

مجمع۔ واہ، واہ،

ہگّو۔ خالی خولی واہ واہ نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم پنچوں میں سے کتنے لوگ میرے ساتھ ساتھ اس سدھار پر چلنے کا بچن دیتے ہیں۔

[سوائے جھگّو کے ساتھیوں کے جن کے ہاتھ میں نریل یا نیچے تھے سب انھیں توڑ توڑ کر پھینک دیتے ہیں]

مجمع۔ (شور) ہم! ہم! ہم! اکا کا ہم بھی!

[ایک بڑھا اپنا مٹھی لے کر آہستہ آہستہ مجمع سے کھسکتا ہے]

ستی کی ماں۔ اور تم کہاں چوروں کے سمان بھاگے جارہے ہو ستی کے پتا؟ (اور تم کہاں چوروں کی طرح بھاگے جا رہے ہو ستی کے باپ؟)

[سب کی نظریں بھاگنے والے کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ بے ساختہ قہقہہ پڑتا ہے۔ بڑھا بیوی کو بڑے غصہ سے دیکھتا ہے۔ پھر ٹھی زور سے زمین پر پٹک دیتا ہے]

ستی کا باپ۔ لے! لے! اب تو تو خوش ہوئی؟ یہ اب جو پیٹ میں درد اُٹھے گا......

ستی کی ماں۔ ارے ہم استریوں کو پیٹ کی پیڑا سے کا ڈراوت ہو؟ استریوں ہی کی پیڑا کا کھیل تم ہوں ہو اور ای سب ہی! (ارے ہم عورتوں کو پیٹ کے درد سے کیا ڈراتے ہو۔ عورتوں ہی کے درد کا کھیل تو تم بھی ہو اور یہ سب بھی!)

[زور کا قہقہہ]

ہنگو۔ (ہاتھ اُٹھا کر) تو بھائیو! اگر اسی طرح شریر کی پیڑا اور من کا شکھ چاہتے ہو تو ہم کو سرپنچ بناؤ۔ جب تک یہ گاؤں بھارت کا سب سے اچھا گاؤں مان لیا نہ جائے نہ میں چین سے بیٹھوں گا، نہ تمھیں سکھ سے بیٹھنے دوں گا۔ بس ہر سمے کام، ہر سمے کام! نیند حرام، آرام حرام! وہی بات جو جنتا کا پیارا نہرو کہتا ہے۔ سکام نہ کرنا ہو تو میرا سلام! چن لو چک چک بک بک کو!

[قہقہہ، ہنگو سلام کرکے بیٹھ جاتا ہے۔ گویا لیکچر ختم ہو جاتا ہے]

گوپال۔ استری، پُرشو! تم نے جھگّو اور ہگّو دونوں بھائیوں کی باتیں سُن لیں، اب تمھیں بتانا ہے کہ تم کسے اپنا سرپنچ چُنتے ہو۔

ایک شخص۔ کاکا آپ کس کو چاہتے ہیں؟

گوپال۔ (ہنس کر) میں دونوں کو جانتا ہوں۔ میرے دونوں بیٹے! (قہقہہ)

متئی کا باپ۔ ارے یہ ہگّو تو کھائی ہگّا بند کس ہے۔ جھگّو ہوگا تو پانی بھی بند کروئے گا! (قہقہہ)

گوپال۔ بتاؤ کہ تم اُن دونوں میں سے کسے سرپنچ چُنتے ہو۔ جھگّو کو کہ ہگّو کو؟

مجمع۔ (سوائے جھگّو کے ساتھیوں کے) ہگّو کو! ہگّو کو!

گوپال۔ تو سارے پنچوں کی یہی رائے ہے۔

مجمع۔ ہاں، ہاں سارے پنچوں کی!

متئی کی ماں۔ (کھڑی ہو کر) اور سارے پنچنوں کی بھی! جرا ہم سبھی تو دیکھیں کہ مرد پیٹ کی پیرا ہووے پہ کا جنت ہَیں! (قہقہہ)

(ذرا ہم بھی تو دیکھیں کہ مرد پیٹ کا درد ہونے پر کیا جنتے ہیں؟)

تمت

بے وقوف

۱۹۵۴ء

ہندوستان میں کچھ رشتے بڑے ہی پیارے ہوتے ہیں۔ برابر والوں میں بہنوئی، سالے، سالی، دیور، بھابھی کے رشتے اور بزرگوں میں ماموں ممانی کا رشتہ۔ سالے سالی سے چھیڑ چھاڑ، مذاق دل لگی، گالی گلوچ، سب مباح! ادھر بھابھی دیور ہیں تو ہاتھا پائی تک جائز! لیکن ماموں ممانی بزرگ ہونے پر بھی مذاق سے نہیں بچتے۔ یو۔پی کے دیہاتوں کی مثل ہے "آدھی ماما کی آدھی چھرے پہ لگائے رسگری ہوئے!" شاید اس دیدہ دلیری کی وجہ ہندو بھائی بہن کی محبت ہے۔ باپ کے ترکے میں حصہ نہ پانے والی بہن بھائی کے دل کی ساری دنیا جیت لیتی ہے۔ بھانجے اسی پہ اترا لیتے ہیں، اور ماموں ہر طرح کے ظلم خوشی خوشی برداشت کرتے ہیں۔ عجیب موہنی ہے اس لفظ میں۔ کہتے ہیں سانپ کو بھی ماموں کہہ دو تو وہ نہیں کاٹتا۔ بڑے بڑے ڈاکو بھی یہ خطاب پاتے ہی رام ہو جاتے ہیں۔ اکثر فرقہ وارانہ لڑائیاں اس رشتے کا واسطہ دینے پر ٹھنڈی پڑ گئیں! اور شمشیر تلواریں اس لفظ کی برکت سے اٹھے ہوئے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر گئی ہیں۔ ان پانچ حرفوں میں نہ جانے کون سا جادو بھرا ہے کہ جہاں یہ منہ سے نکلا وہاں محبت کے دریا اور پریم کے ساگر دل سے پھوٹ نکلے!

یہ سب تو ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ ماموں ہمیشہ بیوقوف بھی سمجھا جاتا ہے۔ اور جب گاؤں بھر کسی کو ماموں کہے تو یقین مانئے اس کی بیوقوفی پر مہر لگ گئی! یہی حال محمد پور والے ناصر ماموں کا تھا ـــــ وہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ وہ حاجی تھے، وہ گاؤں بھر میں عمر میں سب سے بڑے تھے۔ زمانہ بھی ۱۹۲۱ء کا تھا جب زمیندار ہنسی کے قابل چیز نہ تھا۔ وہ اپنے گاؤں کا بادشاہ تھا وہ سفید و سیاہ کا مالک تھا وہ اُجاڑ بسا سکتا تھا۔ محمد پور کوئی ایسا بڑا گاؤں بھی نہ تھا کہ کہا جاتا ناصر کے خلاف دوسری پارٹیاں ہوں گی۔ یا وہ ہزاروں ہزار کے مجمع میں کھو جاتے ہوں گے۔ یا وہاں اتنے سخت انقلابات آگئے ہوں گے، تبدیلیاں ہو گئی ہوں گی کہ لوگ ناصر جیسے بڑے زمیندار کو بھول گئے ہوں گے۔

محمد پور فیروز تغلق کے زمانہ میں آباد ہوا تھا۔ یہاں کے زمیندار شیوخ تھے۔ اور سب ایک ہی اصل کی شاخیں۔ گاؤں کا کل رقبہ پانچ مربع میل سے زیادہ نہ تھا۔ اسی میں دو ہزار کے قریب آبادی اور اسی میں کھیت اور باغ۔ کاشت وہی تھی جو عام طور سے ربیع و خریف میں یو۔پی کے پوربی ضلعوں میں ہوتی ہے۔ ہاں ادھر بیس پچیس برس سے گنے اور آلو کی کاشت پر زیادہ دھیان دیا جانے لگا تھا۔ بہار کے قرب ہونے کی وجہ سے دار جلنگی آلو آسانی سے مل جاتا تھا اور گورکھپور کے آس پاس شکر ملوں کے کھل جانے سے گنا گاڑیوں میں لاد کر باہر بھیجا جانے لگا تھا۔

شریف یعنی زمیندار خود کھیتی نہ کرتے تھے۔ میر تک کے کھیت ٹکی اُٹھاتے

تھے۔ ان کا محلّہ عام لوگوں کے گھروں سے الگ تھلگ تھا۔ عوام بھی پیشے اور قوم کے لحاظ سے جُدا جُدا ٹولیوں میں بسے ہوئے تھے۔ کوریانہ الگ چمار ٹولی جدا اور اہیر ٹولی علٰحدہ۔ شیخواڑے کے پاس کچھ بنئے رہتے تھے، کچھ پٹھان۔ انھیں سے ملے جُلے کچھ کنجڑوں کے گھر تھے اور کچھ جولاہوں کے۔ گاؤں کے مہتر کا گھر تاڑی خانے کی طرح سب سے الگ تھا۔ اُس کے سامنے والی گڑھیا میں اس کے سور گندگی کھانے اور اُچھالنے میں مصروف رہتے تھے۔

رعایا پرجا اکثر پھوس کے چھپروں میں رہتے۔ کھپریل سے شاذ و نادر ہی ان کا مکان چھایا ہوتا۔ تنگی و تاریکی ان کی خصوصیت تھی۔ زمینداروں کے مکان دو حصّے میں بٹے ہوتے تھے۔ مردانہ و زنانہ۔ مردانے میں ایک کنواں، ایک بڑا سا صحن، دو ایک لمبے لمبے دالان۔ اور ان کی بغل میں دو ایک کمرے ہونا عام دستور تھا۔ صحن کے دوسرے کونے میں "میاں" کی بیٹھک سے الگ دو ایک کوٹھریاں ملازموں کی ہوتی تھیں، ان میں پیادے رہتے تھے، رات دن کے حاضر باش خادم بھی اور شب کو پہرا دینے والا چوکیدار بھی۔ زنانخانہ بھی خاصا وسیع ہوتا تھا۔ بڑے بڑے صحن، بڑے بڑے دالان، اونچی اونچی نشستیں مگر اس کا خاص اہتمام ہوتا کہ کوئی جھروکا یا کھڑکی اتنی نیچی نہ ہو کہ کوئی اندر یا باہر سے جھانک سکے۔ رعایا کی عورتیں باہر نکلتیں، اپنے مردوں کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتیں اور زندگی کا بوجھ اُٹھانے میں کندھے سے کندھا ملا کر چلتیں۔ مگر زمینداروں کی بیویاں سخت پردہ کرتیں۔ اور اندھیری راتوں میں بھی ڈولیوں، فیٹنوں اور چوپہلوں میں بیٹھ کر ایک ہی محلے میں ایک گھر سے دوسرے گھر جاتیں۔ ان کا کام پلنگ

کے باندھ توڑنا اور مشغلہ پان بنانا اور چبانا تھا!

ناصر تین چوتھائی گاؤں کے مالک تھے۔ ان کا مکان حویلی کہلاتا تھا۔ وہ گاؤں میں سب سے زیادہ شاندار تھا۔ اور وہ پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اس کے پختہ کنوئیں کی جگت پر لگان ادا کرنے والے سیکڑوں کسان بیک وقت آکر بیٹھتے تھے۔ پھر بھی ناصر کا کوئی رعب نہ تھا۔ کوئی ان کو "میاں، ٹھاکر یا مالک" کہہ کر نہ پکارتا تھا۔ اور نہ اُن سے باتیں کرنے میں کسی کے تھرتھری چھوٹتی تھی۔ سب اُنھیں منھ در منھ ماموں کہتے اور ان سے باتیں کرتے اس طرح مسکراتے جیسے وہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار سے باتیں نہیں کر رہے ہیں بلکہ کسی نیم خبطی سے!

یہ یقینی ہے کہ ناصر کی صورت شکل بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ لمبوترا کدو جیسا سر، اس میں بال اتنے کہ ان کے گن لینے میں نہ تو نائی کو کوئی زحمت ہو اور نہ خود ناصر کو کوئی دقت۔ پیشانی بہت لمبی مگر چوڑائی میں تین انگل۔ بھویں موٹی موٹی آنکھوں پر چھپر کے سائبان کی طرح جھکی ہوئی۔ آنکھیں دھنسی اور بجھی ہوئی، ناک موٹی بھدی اور بڑی۔ بانس بھیلا ہوا گال پچکے ہوئے کا تھوڑی خربوزے کی طرح جھرّیوں سے گھر درے۔ لب موٹے اور سوکھے۔ داڑھی چھدری۔ ایک منٹ سے قریب لمبی۔ ان کے سفید بال اتنے بڑے ہونے پر بھی سلوں برتنوں کے ریشوں کی طرح سخت اور کھڑ کھڑے۔ گردن لمبی اور پتلی، کسی خاص دکھ سے بوجھل ہو کر جھکی ہوئی۔ قد تھا تو چھ فٹ مگر کندھوں کے جھکے ہونے نے اس کو ٹھگنا بنا دیا تھا۔ چلتے تھے تو ایک پاؤں پورا نہ رکھتے تھے کہ دوسرا زمین کو چھوتا آگے بڑھ جاتا تھا۔

محسوس ہوتا زمین کو پاؤں سے کھُرچ رہے ہیں یا لنگڑے گھوڑے کی طرح ٹاپ مار رہے ہیں۔ اُن کا پوپلا منہ ہر وقت کھُلا رہتا تھا اور ہر منٹ دو منٹ پر ایک "ہُوں ہنہ" کی آواز منہ سے نکل جاتی تھی۔ سنِ شریف بچپن سے آگے نکل گیا تھا، مگر ہر وقت بے موقع ہنس دینا اُن کا خاص انداز تھا۔ ایسے حالات میں جن میں دوسرے رُو رُو دیتے تھے ناصر "ہُوں ہنہ" کہہ کر ہنس پڑتے تھے۔ اور جہاں دوسرے بھی ہنستے ہوں، وہاں ان کا قہقہہ اتنا بڑھتا کہ وہ لوٹن کبوتر بن جاتے! یوں تو گاؤں بھر ناصر کو بیوقوف سمجھتا تھا مگر اس میں سب سے آگے تھے خود ان کے فرزند ارجمند رئیسِ اعظم جعفر۔ ناصر کو دور ہی سے آتے دیکھ کر وہ جیسے خفا ہو جاتے تھے۔ ان کی تیوریوں پر بل آجاتا تھا۔ وہ اپنے باپ سے مشابہ "ہُوں ہنہ!" کہہ کر اُن کی طرف سے منہ پھیر لیتے۔ نہ کبھی صبح کو اٹھ کر وہ ایک بیٹے کی طرح ناصر کو سلام کرتے تھے اور نہ کبھی بیٹھے ہونے پر ان کی تعظیم کو اُٹھتے تھے۔ بلکہ اگر دوسرے تعظیم کے لئے اُٹھتے تو جعفر یہ کہہ کر بٹھا دیتے "بیٹھو بھی! بابو آیا ہی جایا کرتے ہیں!"۔ جعفر کی ناصر سے خفگی کی وجہ شاید یہ تھی کہ ناصر کو دیکھ کر انھیں یہ یاد آجاتا تھا کہ وہ اسی بے وقوف کے لڑکے ہیں یا یہ کہ ان کی ساری شان و شوکت، حکومت و ریاست اسی سٹری اور خبطی کی بدولت ہے۔

انھوں نے جعفر کو ان کے عنفوانِ شباب ہی میں سارے گھر کا مدار المہام اور ساری جائداد کا منیجر اور مختار بنا دیا تھا۔ جعفر پندرہ برس کے تھے کہ صالحی نے انتقال کیا۔ بیوی کے مرنے کے بعد ناصر کو زنانہ مکان جیسے کاٹنے لگا۔ وہ مردانہ مکان کے ایک کمرے میں اُٹھ کر چلے آئے۔ اور انھوں نے سال کے اندر ہی

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

جعفر کی شادی کر کے سارا گھر اور کاروبار ان کے حوالے کر دیا۔ اب وہ صرف دوپہر اور رات کو کھانا کھانے اندر جاتے تھے۔ بہو نے یا پوتوں میں سے کسی نے آکر سلام کیا تو دعائیں دیدیں۔ اگر کسی کو اتنی بھی توفیق نہ ہوئی، اور بہو نے اپنا پاندان اور پوتوں نے اپنے کھلونے کی رفاقت نہ چھوڑی تو وہ تختوں کے چوکے پر جلدی سے بیٹھ کر دو چار نوالے اپنے کھانے کی سینی میں سے کھا لیتے اور ویسے ہی جھوٹا ہاتھ لئے باہر چلے جاتے تھے۔

شوہر نامدار کی دیکھا دیکھی بہو نے ماموں کو سڑی سمجھ رکھا تھا۔ وہ کاہے کو اس کھٹکتیں۔ جو میاں کی آنکھوں میں ذلیل، وہ ان کی نظروں میں ذلیل و حقیر۔ رہیں پوتیاں تو وہ بچہ تھیں۔ تخم تاثیر صحبت اثر! وہ جعفر کے درخت کا پھل تھیں اور انھیں کی بیوی کا ان بچیوں کے سر پر سایہ تھا۔ خربوزے کو خربوزہ دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے قدم بہ قدم چلتی تھیں۔

جعفر اور ان کے عیال پلتے تو تھے ناصر ہی کی جائداد اور زمینداری کی آمدنی پر مگر محسوس ایسا ہوتا تھا جیسے ماموں ہی ان کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ ہاتھ کا بدل جانا بھی عجیب چیز ہے۔ اپنی جیب سے پیسے نکال کر کسی کو دیجئے وہ سمجھے گا آپ نے احسان کیا۔ اپنے ہی پیسے دوسرے کی جیب میں رکھوا کر اس سے مانگئے اس کے انداز کہیں گے آپ بھکاری ہیں! ناصر ماموں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اب سے بیس برس پہلے جب جعفر کی دلھن نئی نئی آئی تھیں۔ ماموں کو غیر شعوری طور پر اپنا گھر اُجڑا ہوا محسوس ہوا، وہ اپنی تنہائی سے گھبرا اُٹھے۔ کچھ اندوختہ تھا، کچھ قرض لیکر

انھیں نے سیر و تفریح، حج و زیارت کی ٹھانی۔ ہندوستان چھوڑتے وقت املاک و جائداد کا جعفر کے نام مختار نامہ عام کر دیا۔ ناصر کے سفر پر سدھارتے وقت جعفر بھی رو رہے تھے۔ بہو نے بھی آنسو بہائے تھے اور پوتیاں بھی بلکی تھیں۔ مگر جب پانچ برس بعد ماموں گھر پلٹے تو ان رونے والوں میں سے کوئی بھی نہ ہنسا، کسی کو ان کے بخیریت واپس آجانے پر خوشی نہ ہوئی۔ جعفر حکومت کرنے اور اہم سے اہم معاملات میں مالکانہ فیصلہ کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے انھوں نے نہ تو جائداد کے انتظام میں، نہ زمین کے تردد میں ماموں کو دخیل بنانا گوارا کیا اور نہ ماموں ہی کی ہمت پڑی کہ وہ ان سے الگ بنجی احکام جاری کریں۔ ان کی زندگی بالکل اس باپ کی بن گئی جو اپنا بڑھاپا بیٹوں کے سہارے اور انھیں کی سرپرستی میں کاٹتے ہیں۔ وہ ہر چیز کے مالک ہونے پر بھی کسی چیز پر اختیار نہ رکھتے تھے!

شروع شروع میں پرانے ملازموں نے جدید اور قدیم مالکوں کو آپس میں اُلجھانے اور لڑانے کی کوشش کی۔ مگر کچھ ہی دنوں میں وہ ماموں کی اس شکست خوردہ ذہنیت سے ہار گئے کہ جہاں انھوں نے سُنا کہ ناصر نے ان کے حکم کے خلاف حکم دیا ہے انھوں نے جھٹ اپنے پچھلے فیصلے کی تردید کر دی۔ وہ ذرا جھڑک کر پیادوں سے کہتے "ارے جب جعفر حکم دے چکے تھے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھا۔ وہ مجھ سے زیادہ نئے حالات سے واقف ہیں۔ انھیں سے پوچھا کرو، مجھے نہ پریشان کیا کرو!" ـــــ عدالت عالیہ جب خود ہی اپنے کو ڈکٹیٹر کا ماتحت سمجھے تو پھر قانونی چارہ جوئی کی کیا ضرورت؟ اور کہاں گنجائش؟۔ مخالف پارٹی

ہتھیار ڈال دیئے۔ جعفر آمر بن گئے!۔

زمینداری اور باغوں سے ماموں کی آمدنی لگ بھگ ایک ہزار ماہوار تھی باغوں میں ان کا امرود کا باغ دور دور مشہور تھا۔ اس کے پھل بہت بڑے بڑے ہوتے تھے۔ ان کا چھلکا پتلا اور گودا سفید شیریں ہوتا تھا۔ الہ آبادی امرودوں کی طرح ان میں بیج بھی بہت کم ہوتے تھے۔ ماموں نے اپنے انتظام کے زمانے میں اس باغ کے پھل کبھی نہ بیچے۔ وہ انھیں بڑے اہتمام سے تڑواتے اور اعزاء و برادری میں تحفے کے طور پر بھیجتے تھے۔ لوگ جب ان امرودوں کی تعریف کرتے تو ناصر ماموں پہلے تو پھول کر اس طرح مسکراتے جیسے ان گود کے بچے کے حسن کی تعریف سن کر کوئی اتراتی ہے۔ وہ "ہونہہ" کہہ کر تعریف کرنے والوں کے پاس سے اٹھ جاتے اور گھر جاکر انھیں فوراً ہی تھوڑے امرود پھر بھیج دیتے تھے ــــ لوگوں کو بار بار امرود کھانے کے لیے یہ نسخہ اچھی طرح یاد تھا۔ مگر جب سے جعفر کا دور دورہ ہوا تھا امرود کے باغ کی فصل ہر سال دو ڈھائی سو میں بیچ دی جاتی تھی۔ اور گاؤں والے ان پھلوں کو مول لے کر کھاتے تھے۔ اگر کبھی کسی نے جعفر سے پرانی ریت بدلنے کی شکایت کی تو وہ منہ بنا کر کہتے "ہونہہ! میں بھی کیا بابا کی طرح بے وقوف ہوں کہ سیکڑوں روپے کی چیز آپ لوگوں کو مفت تحفے میں بانٹ دوں!" ــــ مگر ناصر سے جب کوئی اس کا ذکر کرتا تو ان کے چہرے پر رنگ آ جاتا اور آنکھوں میں آنسو۔ گویا وہ امرود کے پھل نہ تھے بلکہ کسی شریف گھرانے کی لڑکیاں، جو کسی بدمعاش کے پھندے میں آ کر گھر کی زینت بننے کی جگہ بازاری بن گئی تھیں!۔

اتنی بڑی جائیداد میں اب ناصر کا حصّہ تھا، صبح کا ناشتہ، دو وقت کا کھانا، ایک پیسہ روزانہ کی تمبا کو، سال میں چھ کرتے چھ مارکین کے پائجامے، ایک جوڑ سلیم شاہی جوتا، دو تہمدیں ایک کھڑاؤں اور دو لنگی نما چارخانے کے رومال منہ میٹھا کرنے کے لئے گُڑ، ریوڑی اور گنڈے کبھی کبھی عنایت ہوجایا کرتے تھے یا کہیں سے حصّے میں آئی ہوئی مٹھائیاں۔ اور یہ سب ناصر کو اس انداز سے دیا جاتا تھا جیسے جعفر کی طرف سے خاص پرورش ہو رہی ہے، ایک غیر مستحق کو عطیہ عنایت کیا جا رہا ہے!

لیکن ماموں نے زندگی کچھ ایسے ڈھرے پر ڈال دی تھی کہ جعفر انہیں چاہے کچھ دیتے یا نہ دیتے وہ بسر ہی ہو جاتی۔ صبح سویرے، اس وقت جبکہ کوّے بھی سوتے رہتے ہیں اور مرغ کو بھی نیند آتی رہتی ہے ناصر اُٹھ جاتے نہاتے دھوتے، نماز اور وظیفہ پڑھتے اور دھندلکے ہی میں گڑ کی ایک ڈلی منہ میں ڈال کر پانی پیتے اور تسبیح پڑھتے چہل قدمی کو نکل جاتے۔ وہ سوتی ہوئی گلیوں سے نکل کر جاگتے ہوئے کھیتوں اور باغوں کی گلگشت کرتے، اپنے امرودوں کے درختوں میں گھومتے، اُن کو دلاسا دیتے یا ان کو بُرا بھلا کہتے گھر کی طرف مُڑ جاتے تھے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ وہ اپنے بڑے پھاٹک میں پھر طلوع ہوتے۔ اس وقت وہ حقہ پیتے۔ اس کا اہتمام اُن کے پرانے ملازم خلیل خاں کے سپرد تھا۔ وہ خود افیون کا عادی تھا۔ وہ ماموں کے ساتھ ہی جاگ اُٹھتا اور ان کی دیسی تک جنیا بیگم کی چسکی لگا کر اپنا زیل گڑ گڑاتا ہوتا اور میاں کے حقے کی چلم پہ آگ رکھ کر تیار رکھتا۔ ماموں اب ناشتہ کرتے۔

وہ ہوتا باسی روٹی کے ساتھ انڈے کا چیلّا یا رات کا رکھا ہوا کباب۔

ماموں کے ناشتے اور حقے میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہ صرف ہوتے۔ اب ان کی دوسری گشت کا وقت آجاتا۔

وہ اب کے سب سے پہلے اپنے ہم سنوں کے ہاں جاتے، کوئی مسجد سے پلٹتا ملتا، کوئی اپنی جانماز پر اور کوئی پلنگ پر بیٹھا حقے کے لمبے لمبے کش لیتا ہوتا۔ وہ ہر ایک سے دو گال ہنستے بولتے پورے گاؤں کا چکر لگا ڈالتے۔ اس مزاج پرسی اور بے تکلفانہ گفتگو میں نہ تو سن کا لحاظ ہوتا تھا، نہ رتبوں کا، نہ طبقات و جنس کا۔ اپنے سے چھوٹوں سے اسی طرح ٹھٹھول کرتے جس طرح اپنے برابر والوں سے۔ ہمسر زمیندار جس طرح پوچھے جاتے اسی طرح کلّو جولاہا، ننھو نداف، منگی کہار، نبسی پاسی اور سکھدیا دھوبن!

سکھدیا کو چھیڑنے میں ماموں کو بڑا مزہ آتا تھا۔ جب کل چھ جوڑے ہوں اور دوسرے دن کپڑے بدلنا ضروری ہو تو دھوبن بڑی اہم ہستی بن جاتی ہے۔ اسے ہنسا بولا کو خوش رکھنا ہی ہوتا ہے۔ ماموں غالباً اسی لئے اس کے گھر کے پھیرے ضرور لگاتے، اور جب اس سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو حسب عادت چھیڑتے بھی ضرور۔ سکھدیا خود بھی تھی بڑی تیز۔ وہ بھولی بھالی جھینپو وسیاتن نہ تھی۔ وہ تھی فیض آباد کی لڑکی۔ ضلع جگت، پھبتی، پھکڑ وہ کسی بات میں بند ہونے والی نہ تھی۔ جوان جب اسے "بھوجی" کہہ کر چھیڑتے تو وہ ایسے گرما گرم جواب دیتی کہ بڑے بڑوں کے دانت کھٹے ہو جاتے۔ مگر ماموں کو وہ کیا جواب دیتی۔ وہ بوڑھے بھی ٹھہرے اور پیاس سسرے کے ناتے بھی۔ مگر ماموں کب ماننے والے تھے۔

وہ اسے دیکھتے ہی پوچھتے "کہو فیض آبادن آج کس بیوی کا پائجامہ پھاڑا، کس کا شلوکا سکایا؟" ۔ وہ جلبلا کر کوئی سخت جواب دینا چاہتی کہ ان کے پوپلے منہ پر نظر پڑ جاتی اور وہ لمبا سا گھونگھٹ نکال کر پاؤں پٹکتی چلی جاتی ۔ جب وہ اموں کے ان بوڑھے چونچلوں کی ساس سے شکایت کرتی تو وہ بوڑھیا "ہی ہی" کر کے ہنستی اور دوپہر کے کھانے کے بعد جب اس کے چھپر میں اس کی ہمسن عورتیں کپڑے لینے یا دینے آتیں اور ایک دوسرے کے سر کی جوئیں دیکھنے کا بہانہ کر کے بیٹھ کر گپیں لڑانے لگتیں تو ساس سکھدیا کی جھنجھلاہٹ اور اموں کی "چھیڑ خوانی" کا ذکر ضرور کرتی ۔

پن بھرن نو لکھیا ایک لمبی سانس لیکر کہتی "ارے اموں کے بس ہانتھ بھر کی جبان (زبان) ہے اور کچھ نہیں !"

جمراتن نائن کہتی "ارے چلو، وہ سدا کے ایسے ہی تھے ۔ جوانی میں بھی وہ بس ہنہناتے ہی تھے !"

برتی مہری بول اٹھتی "ہونہہ ! ان کی کھلی چلائی ! اپنی بی بی کے گھڑے کے سوا انھیں کبھی کچھ نہ سوجھا !" ——— اور اموں کے کھوئے ہوئے رومانی مواقع کا بھی کبھی کبھی کرکے ذکر کرتیں اور ان کو سدا کا بیوقوف ٹھہرا کے اپنے اپنے گھر سدھارتیں ۔

اموں کے صاحبزادے جعفر کو یہی باتیں تو باپ کی حد درجہ ناپسند تھیں ۔ جعفر گاؤں کے رئیس تھے ۔ زمیندار تھے ۔ مالک تھے ۔ وہ طبقات کی سختی کے قائل تھے ۔ وہ ایسوں ویسوں سے بات کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے ۔ انھیں اموں کا ہر ایک کی خیر صلاح پوچھتے پھرنا، ہر ایک سے بے تکلفی سے باتیں کرنا حد درجہ کھلتا

تھا۔ ان کے نزدیک انسان یا تو حاکم ہو سکتا تھا یا محکوم، زمیندار یا رعیت۔ اور کپلنگ کے مشرق و مغرب کی طرح کبھی یہ ایک دوسرے سے نہ مل سکتے تھے۔ اب یہ ناصر ماموں کی حماقت ہی تو تھی کہ بیٹے کے ان خیالات کے باوجود وہ اپنے کو سب کا جیسا سمجھتے تھے۔ نہ انھیں اپنے میں سرخاب کا پر لگا دکھائی دیتا، اور نہ ان کی سمجھ میں یہ واضح بات آتی کہ زمیندار ہوتے ہی انسان کا خمیر بدل جاتا ہے۔ وہ اسی مٹی کا بنا نہیں رہ جاتا جس سے عام لوگ تیار کئے جاتے ہیں۔ آخر منگ مرتبان اور گاؤں کے کمہار کی بنائی ہانڈی میں فرق ہوتا ہی ہے۔ اب اتنی موٹی عقل والے ماموں کو بیوقوف نہ کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا؟۔

لڑکے عام طور سے ماموں سے بہت انوس تھے۔ وہ جب کسی سے بہت خوش ہوتے تو اسے اپنے ساتھ گھر تک لے جاتے۔ پہلے ادھر اُدھر نظر ڈال کر دیکھ لیتے کہ کہیں جعفر تو موجود نہیں ہیں۔ پھر اپنا کمرہ کھولتے، الماری میں رکھے ہوئے گڑ، ریوڑی یا گٹے میں سے ایک مٹھی اُٹھاتے اور اس لونڈے کو ایک ہلکی سی ٹیپ لگا کر اس کے دامن یا ہاتھ میں یہ تحفہ دے کر کہتے "لے بھاگ! دوسروں سے نہ کہنا نہیں تو سب میرا سر کھا جائیں گے!" ـــــ مگر دوسرے لڑکوں پر ماموں کی یہ نوازش چھپی نہ رہتی سو وہ پہلے ہی سے بھانک کی بغل میں چھپے ہوئے جھانکتے رہتے۔ جہاں ایک نے مٹھائی پائی سب ایک ساتھ یورش کر دیتے۔ "ماموں ہمیں! ماموں ہمیں بھی! ماموں ہمیں بھی!" اور ماموں بیچارے کو پوری محفل کا حصہ بانٹنا پڑتا۔ کبھی کبھی جب وہ بہت زچ ہوتے تو خلیل خاں کو مدد کے لئے آواز دیتے۔ وہ انیوٹی ہونے پر بھی پٹھانی دم خم رکھتا تھا۔ اس لئے اس کے آتے ہی مٹھائی کے

ساتھ ساتھ لڑکوں کو جھڑکیاں، لپّڑ اور گھونسے بھی حصّے میں آجاتے اور بات بچّوں سے بڑھ کر بڑوں تک پہنچ جاتی۔ جعفر جب کبھی ان تقسیموں کا حال سُنتے تو مُنہ بنا کر کہتے "ہونہہ! ابا تو بالکل سٹھیا گئے ہیں۔ نہ انھیں اپنے سن کا خیال ہے نہ میرے مرتبہ کا! نہ جانے کہاں عقل کھو آئے!"

جعفر کو ماموں کی ایک اور عادت حد درجہ ناپسند تھی۔ دن کے بارہ بجے ہوں یا رات کے، اولے پڑتے ہوں، یا آگ برستی ہو، پانی برس رہا ہو یا لُو چلتی ہو۔ جہاں خبر ملی کہ تین کوس کے اندر کوئی شیخ زادہ مرگیا، بس ماموں ڈُبکی دوڑتے وہاں پہنچ گئے۔ اب صاحبِ غم کو کفن دفن کے انتظام سے کوئی مطلب نہیں۔ ماموں گورکن بلوا رہے ہیں، کفن منگوا رہے ہیں، تختے چروا رہے ہیں اور غسل وغیرہ کا سامان کر رہے ہیں۔ اب جب تک وہ مردہ دفن نہ کردیا جائے گا اور اہلِ خانہ فاقہ شکنی نہ کرلیں گے ماموں وہاں سے نہ ٹلیں گے۔ جعفر کو اس سلسلے میں دو باتیں حد سے زیادہ کھلتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ماموں اس فرض کی ادائگی میں دوست دشمن میں فرق نہ کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ کبھی کبھی ایسے نادہند بھی مل جاتے تھے کہ وہ نہ گورکن کی مزدوری ادا کرتے، نہ کفن کے دام دیتے اور نہ تختہ چروانے کی اُجرت! اور یہ سارا خرچ ماموں اپنی جیب سے دیتے یعنی جعفر سے دلواتے اس طرح کے حساب کے صاف کرنے میں ماموں کا لب و لہجہ وہی پرانا حاکمانہ، مالکانہ اور بدرانہ ہو جاتا تھا۔ جعفر مردے کو کوستے، اس کے گھر کا گھر صاف ہو جانے کی دُعا کرتے مہینوں اس فضول خرچی کا رونا روتے اور بار بار ہر ایک سے کہتے "دیکھتے ہیں آپ، ابا کس طرح اپنی بیوقوفی سے مجھے تباہ و برباد کر رہے ہیں!"

ماموں کی اس بیوقوفی کا سب سے عجیب صلہ ملا تھا اُنھیں عورتوں سے۔ جب دو مائیں اپنے اپنے بچوں کی حمایت میں لڑتیں اور معاملہ سنگین ہو کر کوسنے کاٹنے تک پہنچتا تو ہمیشہ ان اس فقرے پر ٹوٹتی "خدا کرے سال کے اندر ہی اندر تیرے اس چہیتے کے لئے "ناصر ماموں آئیں!" گویا ماموں اور ملک لموت بھائی بھائی تھے، گویا حضرت عزرائیل نے اس گاؤں کے لئے ماموں کی سوکھی سہمی حماقت آب صورت اختیار کر لی تھی!

لیکن ماؤں کے ان توہمات کا لڑکوں پر کوئی اثر نہ تھا۔ ان کو تو ماموں ہر منزل پر ایک نئی صورت میں دکھائی دیتے تھے پالنے میں پڑے ہمکنے والوں کے لئے وہ دایہ تھے، گھٹنوں چلنے والوں کے لئے وہ گھوڑا تھے، رونے بسورنے والوں کے لئے وہ گھٹیاں اور گیند باٹنے والے حلوائی تھے۔ اچک پھاندکرنے والوں کے لئے وہ ایک رفری اور امپائر تھے۔ نوجوانوں کے لئے رومان سننے والے ساتھی اور بڑے بوڑھوں کے لئے ان کا ہنسوڑ ہمدم۔ اکثر نوجوان کہتے "ماموں بھی عجیب چیز ہیں۔ ہم کیسی ہی باتیں کرتے ہوں اپنا پوپلا منہ کھول کر ہماری باتیں سننے کو تیار! ہونہہ! نہ بزرگی کا خیال نہ خودی کا!" بوڑھے سر ہلا کر کہتے "ناصر کو بھی سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کا شوق ہے! نہ جانے عقل کہاں کھو آئے ہیں کہ اب جھکے ہوئے ہر وقت اسی کو ڈھونڈھتے رہتے ہیں!"۔

یہ سب تو تھا ہی، مگر ایک واقعے نے تو ماموں کی بیوقوفی پر سچ مچ مہر لگا دی! واقعہ یہ کہ ماموں جب اپنے طویل سفر پر جانے لگے تھے تو انھوں نے ایک عزیز سے پانچسو قرض لئے تھے۔ زبانی لین دین تھی نہ کوئی کاغذ لکھا گیا تھا نہ کسی دفتر میں

جاکر رجسٹری ہوئی تھی۔ آپس کا معاملہ تھا، ماموں کا وعدہ ہی کافی سے زیادہ سمجھا گیا تھا۔ حج سے واپس آتے ہی ماموں نے جعفر سے اس رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا تھا۔ جعفر برابر ٹالتے رہے۔ اب کے رہن خراب ہوئی ہے، اب کے خریف ابھی گھر کی مرمت پر بہت سا پیسہ خرچ کرنا ہے، ابھی بڑی لڑکی کی شادی کا مسئلہ درپیش ہے، آجکل مختلف مقدموں کی وجہ سے بہت خرچہ بڑھ گیا ہے۔ اس مہینے میں چھوٹے لڑکے کا ختنہ کرانا ہے، اب کے بڑے کی تین مہینے کی کالج کی فیس ادا کرنا ہے۔ غرض دو برس یونہی ٹل گئے۔

ایک دن جون کے مہینے میں جب برسات شروع ہو گئی تھی اور کھیتوں کا نیا بندوبست ہو رہا تھا ماموں کے سامنے جعفر نے دو ہزار روپئے وصول کئے۔ ناصر نے جعفر کو اپنے قرض کی ادائیگی پھر یاد دلائی۔

جعفر اس زمانے میں صاحب معاملہ سے کسی بات پر ناخوش تھے۔ وہ ان کو نقصان پہونچانے اور ان سے انتقام لینے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ ماموں کی یاددہانی پر جعفر کے دلی جذبات زبان پر آ گئے — وہ بولے "آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں! آپ نے کوئی پرزہ لکھا ہے، کوئی دستاویز تحریر کی ہے۔ وہ کوئی ہم پر دعویٰ کر سکتے ہیں۔ قرقی لا سکتے ہیں۔ نہ دیں گے تو وہ ہمارا کیا کر لیں گے؟"

جعفر اپنے طور پر بکے چلے گئے، انھوں نے ماموں کے چہرے کا اتار چڑھاؤ، ان کی آنکھوں کی شعلہ افشانی، ان کے لبوں کی تھرتھراہٹ پر نظر نہ کی۔ ماموں پاؤں ٹپک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بڑے غصّے سے بولے:۔

"پھٹکار ہو تمہاری نیت پر! تم نے میری دنیا تو خراب کی ہی تھی، اب چاہتے

ہو کہ میرا دین بھی برباد ہو جائے!"

انھوں نے اپنے کندھے کے رومال کو جھٹک کر گردن میں لپیٹا اور جھپٹتے، گرد اُڑاتے گھر سے باہر نکل گئے۔

راستے میں انھیں دیکھتے ہی کسی جھگڑے کے فیصلے کے لئے لڑکوں نے چیخ کر کہا "ماموں آگئے! ماموں آگئے! اب وہی فیصلہ کریں گے!"۔ مگر ناصر نے ان کی طرف مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ نتھو نداف نے چاہا انھیں روک کر اپنے افلاس اور اپنی تنگدستی کا دکھڑا روئے ماموں نے اس کی ایک نہ سنی۔ سکھدیا نے گڑھیا کے گھاٹ سے پکار کر کہا "ارے ماموں اس دھوپ میں پیک بنے کہاں چلے جارہے ہو!" مگر انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ لپ جھپ گاؤں سے باہر نکل گئے۔ ان کے پاؤں اپنے چہیتے امرود کے باغ ہی میں جاکر رکے وہیں وہ گھنٹوں ٹہلا کئے اور سوچا کئے۔ سوچا کئے اور ٹہلا کئے۔ آخر کار وہ پلٹے۔ تھکے ماندے، ہارے، خاک سے اَٹے۔ سر جھکائے، مغموم اور مجبور، لیکن اپنے گھر نہیں گئے، خدا کے گھر، مسجد میں جاکر بیٹھ گئے۔

ماموں کی خفگی کی خبر گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ چھوٹا بڑا ہر شخص پریشان تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ ماموں کو غصہ آیا تھا۔ ان کی بھولی بھالی شخصیت کا یہ نیا روپ تھا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس نئے ماموں کو کیونکر منائے، کیسے رام کرے۔ خلیل خاں، پرانے وفادار ملازم کو یہ کام سپرد کیا گیا تھا کہ وہ ماموں کی ہر حرکت پہ نظر رکھے، لیکن وہ بھی اس نئے طوفان کے قریب جانے سے ڈرتا تھا بلکہ جیسے ہی اس نے یہ خبر دی کہ ماموں مسجد میں آگئے ہیں، گاؤں

پھر اکٹھا ہو کر ان کی خدمت میں پہونچا۔ جعفر البتہ اپنے زنان خانے ہی میں منھ تھوتھائے بیٹھے رہے۔

ماموں کے بچپن کے ساتھی منیر نے ماموں سے پوچھا۔ "یہ اپنے گھر کی جگہ اللہ کے گھر کو آپ نے ابھی سے کیوں توڑا؟"

ماموں کے جذبات کا بند ٹوٹ گیا۔ وہ غصّے اور تکلیف سے چیخ پڑے۔ "اب وہ میرا گھر نہیں، اس میں جعفر بے دین اور بے ایمان رہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں۔ میری نمازیں، میرے روزے، میری زیارتیں، میرا حج سب کچھ برباد ہو گیا۔ میری زندگی بے برگ و گیاہ صحرا بن گئی۔"

بچّوں نے منانا شروع کیا، نوجوانوں نے خوشامد کی، بڈھوں نے درگذر کرنے کی سفارش کی، خود قرض خواہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: "میں نے اپنا قرض معاف کیا۔"

ماموں اپنی پتلی اور بھرّائی ہوئی آواز میں پھر چیخے: "میں جانتا ہوں کہ تم سب لوگ مجھے بیوقوف گدھا خبطی اور سڑی سمجھتے ہو۔ لیکن مجھے کوئی بھی نہ تو بے ایمان سمجھتا ہے اور نہ بھکاری۔ میری زمینداری ہزاروں ہزار کی ہے سنتے یہ کہہ کر شرمندہ نہ کرو کہ تم نے میرا قرض معاف کیا۔ اس ہاتھ سے (ماموں نے اپنا سوکھا، بدنما، جھرّی پڑا ہوا کانپتا ہاتھ ڈرامائی انداز سے دکھایا) میں نے ہمیشہ دوسروں کو کچھ دیا ہے اور سوائے خدا کے آج تک کسی کے سامنے نہیں پھیلایا۔ میں اسے اب بھی نہ پھیلنے دوں گا۔ میں اس ذلت کی زندگی سے موت زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

منیر خاموشی سے اٹھ کر جعفر کے گھر پہونچا۔ اس نے انھیں باہر بلوا کر دنیا کا نشیب و فراز سمجھایا مگر ان کو تو پانچسو کی رقم اس وقت ہضم کر لینے کا بہت ہی اچھا

موقعہ دکھائی دیتا تھا۔ منیر کو جب یہ محسوس ہوا کہ یہ بیل آسانی سے منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے تو اس نے پورے گاؤں کی طرف سے مقاطعہ کی دھمکی دیدی۔ اور یہ کہہ دیا کہ گاؤں بھر تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ بارے یہ حربہ کارگر نکلا۔ جعفر مجبوراً اندر جاکر پانچسو کی تھیلی لے آئے۔ اور مسجد جاکر انھوں نے سب کے سامنے وہ رقم باپ کے قدموں میں ڈالدی۔ ماموں کو بیٹے پر اعتبار نہ آیا۔ انھوں نے تھیلی کھولی نوٹ اور روپیے ایک ایک کرکے گنے اور کیسہ کو ہاتھوں پر رکھ کر قرضخواہ کو پیش کیا۔ اس نے تسلیم کرکے تھیلی اٹھالی۔ پھر ماموں تن کر کھڑے ہو گئے ـــــ ان کے قد کا جھکاؤ اس وقت تقریباً بالکل غائب ہو گیا تھا ـــــ اور انھوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "میں آپ کا حد درجہ شکر گذار ہوں اور آپ سے حد درجہ شرمسار بھی۔ آپ نے مجھے یہ رقم اس وقت عنایت کی تھی جب میں بڑے مقدس سفر پر جا رہا تھا۔ آپ نے میری زبان پر بھروسہ کیا۔ نہ کوئی تحریر لی نہ کوئی رسید لکھوائی نہ کوئی دستاویز۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ اتنے دنوں تک آپ کی رقم آپ کو واپس نہ کرسکا۔ اس لئے میں خدا کے گھر میں ان سب بھائیوں کے سامنے اور خدا ہی کو گواہ کرکے اپنا امرود کا باغ آپ کو نذر کرتا ہوں اور آپ کے نام ہبہ کرتا ہوں۔ اس رقم کے ساتھ اسے قبول کرکے مجھ پر احسان کیجئے!" اور انھوں نے ہاتھ جوڑ کر اپنے اس خورد کو اس طرح دیکھا جیسے وہ اسے کچھ دے نہیں رہے ہیں بلکہ اس سے کچھ مانگ رہے ہیں!

اس دن سے جعفر ہی کو نہیں گاؤں بھر کو اس کا یقین ہو گیا کہ ماموں یقینی بیوقوف ہیں!۔

نوروز

"آپ جو جی چاہے سمجھیں! گاؤں والے جو دل میں آئے کہیں! مگر میں اس پاجی کی نماز جنازہ نہ پڑھاؤں گا! ہرگز ہرگز نہ پڑھاؤں گا! میرا داماد سہی، مگر تھا تو وہ زانی، شرابی اور جواری!"

مولانا اجتبیٰ نے سمدھی کو ڈیوڑھی میں کھڑے کھڑے جواب دیا اور گھر کا دروازہ دھڑاک سے بند کر لیا۔ اس دھڑاک نے گویا مولانا کے جواب پر مہر لگادی اب اس پر نظر ثانی کی کوئی امید نہیں رہ گئی۔ سمدھی نے حسرت سے بند دروازے کو دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے گردن جھکائے نکل گئے۔

مولانا اجتبیٰ کے لیے بھی یہ فیصلہ کوئی آسان امر نہ تھا۔ اپنے ہی داماد کے جنازہ پر نماز پڑھانے سے انکار اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ آس پاس کے کسی گاؤں میں نماز پڑھانے والا نہ ہو، اخلاق، مروت، انسانیت، عزیزداری، برادری کی تمام روایتوں کے خلاف تھا۔ مگر کیا کریں، خدا کے سامنے کھڑے ہو کر کیسے کہیں کہ اس مردے کے بارے میں اچھائیوں کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے! وہ اپنے داماد کے کرتوتوں سے واقف تھے، وہ گاؤں والوں کو گواہ بنا کر دیا سفید جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے، سب ہی تو جانتے تھے اظہر کو۔ پولیس کا داروغہ،

رشوت، بے ایمانی، جھوٹ، شراب، جوا، عیاشی۔ کون سا عیب تھا جو اس میں نہ تھا۔ اور اس پر سمدھی صاحب کی یہ خواہش کہ اسی پاجی اطہر کی نماز جنازہ پڑھا دو! گویا اس کی ساری برائیوں سے نگر دار محض اچھائیوں کا اقرار کر دو!۔ خدا کے سامنے دیدہ دلیری کے جھوٹ بلوا!۔ ہُنہہ!

مولانا کا لمبوترا چہرا سرخ تھا۔ اُن کی داڑھی کے سفید بال کھڑے تھے اور ان کا چھریرا جسم، جو ایک چھڑی کی موٹھ کی طرح آگے سے جھکا تھا، اس وقت کانپ رہا تھا۔ وہ سمدھی کو یوں جاتے دیکھ کر دروازے کی کنڈی بند کر کے پاؤں پٹکتے اندر چلے آئے۔

ان کا گھر بہت بڑا نہ تھا۔ چھوٹا سا کچا صحن، اُتر رخ کے دالان اندر دالان، پچھم طرف باورچی خانہ، اور پورب جانب دو کوٹھریاں۔ دکن کی طرف کوئی عمارت نہ تھی۔ دیوار سے ملی ہوئی زمین کو دو فٹ کی لمبان چوڑان میں گوڑ کر دھنیا اور پودینا لگا رکھا تھا۔ اسی مزروعہ کے پاس کاٹھ کی گھڑونچی پر دو مٹی کے گھڑے کٹوروں سے ڈھکے رہتے تھے اور ایک چھوٹی سی چوکی پر دو تانبے کے بدقلعی جگہ جگہ سے پچکے ہوئے لوٹے۔ باہری دالان میں تختوں کے چوکے پر چھپا ہوا فرش بچھا تھا، جس پر دیوار سے لگا ہوا ایک گاؤ تھا۔ میلا چکٹ، دونوں پہلوؤں سے روئی کے پھونسڑے جھانکتے ہوئے گاؤ کی بغل میں دری کی ایک جا نماز تھی اور اوراد و وظائف کی کچھ کتابیں۔ اور ایک کاٹھ کا فیض آبادی قلمدان۔

اندر والے دالان میں ایک پلنگ بچھا تھا۔ اس کا بان جگہ جگہ سے مجروح تھا۔ اور اس کی ادوائن ہر بالشت پر گرہ دار۔ اسی کے سرہانے پرانی

دری میں لپٹا ہوا مولانا کا بستر رکھا تھا۔ وہیں ایک کونے میں الگنی پر ایک تہمد لٹکتی تھی، ایک پیوند لگی قبا اور ایک بڑی مُہری کا مارکین کا پاجامہ۔ پلنگ سے ملی ہوئی ایک تپائی پر ایک فیض آبادی زیور رکھنے والا صندوق رکھا تھا، جس پر جزدان میں لپٹی چند کتابیں تھیں اور سب سے اوپر قرآن!

مولانا دالان والے تخت پر اس طرح آکر بیٹھے کہ اس کا جوڑ جوڑ بولنے لگا۔ مگر انھوں نے اس کی فریاد پر دھیان نہ دیا۔ انھیں اس وقت غصّے میں کچھ نہ سُنائی دیتا تھا۔ مرنے والا، اُن کی اکلوتی لڑکی ذکیہ کا شوہر تھا۔ وہ کوئی غیر نہ تھا۔ وہ اپنا ہی تھا اسی لیے تو انھیں اس کی ساری حرکتوں کی خبر تھی۔ رحیمن نے انھیں ایک ایک بات بتادی تھی۔۔ وہ کبھی بھی اس بدمعاش اظہر کو معاف نہیں کرسکتے تھے۔ اس نے ان کی ذکیہ کو طرح طرح کے دُکھ پہنچائے۔ اس کے سینے پر مونگ دلی۔ اس کے ہوتے رنڈی گھر میں بٹھائی۔ شراب پی، جوا کھیلا اور اپنی ہی پونجی نہیں بلکہ ذکیہ کے سارے زیور بھی چوروں کی طرح چُرا کر جوے میں ہار دیے! انھیں ظلموں نے تو ذکیہ کو بیمار ڈال کر بھری جوانی میں دق کا شکار بنادیا۔ اور ذکیہ کے مرنے نے مولانا کو قبل از وقت بوڑھا کردیا، جھکا دیا، بالوں سے سیاہی آنکھوں سے نور چھین لیا۔ ذکیہ ہی تو ان کی سب کچھ تھی۔ ساری پونجی، ساری خوشی، ساری امیدیں، فقیر کے گھر کا دیا، اس کی زندگی کا اجالا۔ ذکیہ کے بعد ان کی زندگی کیا تھی، بالکل ایک بھول بھلیاں کہ بھٹکتے پھرو، نہ سرے کا پتہ، نہ منزل کی خبر، راستے میں نہ جلتا چراغ نہ روغن مشعل، نہ چھٹکی چاندنی، نہ جگمگاتی کرن! بس ایک ہڈیاں ٹھٹھرا دینے والی

ٹھنڈک اور گھور اندھیرا!

اور مولانا اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کا خون کھول رہا تھا، ان کے دل میں نہ جانے کتنی مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ وہ اس مردود اظہر سے اپنی ذکیہ کا بدلہ ضرور لیں، اسے کسی موقع پر پورے گاؤں کے سامنے ذلیل و رسوا کریں۔ افسوس کہ اس کی بیماری اور موت نے اس کا موقع نہ دیا۔ لیکن آج جبکہ یہ کانٹا ٹوٹ کر ہمیشہ کے لئے پہلو میں کھٹکتا رہ گیا۔ سمدھی صاحب اصرار کر رہے ہیں کہ اسی اظہر کی نماز جنازہ پڑھاؤ اور سب کے سامنے جھوٹ بولو کہ یہ نیک تھا، اچھا تھا اور اس نے زندگی بھر نیکی اور بھلائی ہی کی ہے! اس کی صفائی خدا کے سامنے پیش کرو۔ جو اپنی ذکیہ کا قاتل تھا۔ اور ان کی آنکھوں میں ذکیہ کی صورت پھرنے لگی۔

وہ اس کا بوٹا سا قد، وہ اس کا دبلا پتلا جسم، وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، اور وہ اس کا مسکراتا چہرہ! عجب دل پایا تھا۔ اس بچی نے۔ نہ اسے کھانے کی فکر نہ پہننے کی۔ پیسے ہوں یا نہ ہوں، ہر حالت میں خوش۔ ترکاری گوشت نہ پکا ہو، روٹی چٹنی ہی سہی۔ ایک ہی وقت کھانا ملے کوئی عذر نہیں۔ نوکرانی گھر میں ہوئی تو اس کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتی رہی، نہ ہوئی سارا کام خود کر ڈالا۔ جب باپ کے سامنے دسترخوان لگاتی تو اس انداز سے کھلاتی اور کھاتی کہ معلوم ہوتا صرف دال روٹی ہی سامنے نہیں ہے بلکہ انواع اقسام کی نعمتیں دسترخوان پر چنی ہیں۔ اور مولانا کے لئے ہر نوالہ لذیذ سے لذیذ تر بن جاتا۔ وہ خوش ہو کر کہتے "ذکو تو یقینی جنتی حور ہے!" اور وہ بڑی سادگی

سے کہتی "ابا جان، میں ایسی خوش قسمت کہاں۔ یہ خدا کا شکر ضرور ادا کرتی ہوں کہ آپ کو میری پکائی ہوئی ہر چیز پسند آتی ہے؟"

اور مولانا اپنی تربیت و تعلیم پر خود عش عش کرنے لگتے۔ وہ سوچتے تھے دماغ اور دل میں فرق ضرور ہے۔ انھوں نے مذہب کو دماغ کے ذریعہ سمجھا تھا۔ ان کی کتابوں میں یہی لکھا تھا، ان کو تعلیم یہی دی گئی تھی اور ان کی فکر بھی یہی کہتی تھی، اس لئے مجبوراً مذہبی احکام مانو۔ مگر دل نے ہمیشہ بغاوت کی۔ جو کی روٹی میں وہ مزہ کیسے ہو سکتا ہے جو شیرمالوں میں ہے۔ سادے چاول اتنے خوش ذائقہ کیسے ہو سکتے ہیں جیسی کہ بریانی ہوتی ہے۔ مارکین اور گاڑھے کے پہننے میں جسم کو وہ آرام کہاں مل سکتا ہے جو مخمل اور ریشم میں ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے گھر کی صفائی کرنے اور کھانا پکانے میں وہ راحت کہاں جو ماماؤں سے کام لینے میں ہے۔ لیکن ذکو نے مولانا ہی کی زبانی سنی سنائی باتوں کو دل میں گرہ کر رکھا تھا، اس نے مذہبی احکام کو اس طرح اپنایا تھا کہ وہ اس کی طبیعت، اس کا مزاج بن گئے تھے۔ وہ انھیں کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ محسوس ہوتا کہ مذہب کی روح نے ذکو کی صورت میں جنم لیا ہے۔

اس طرح کی بجی اور بیاہ دی گئی اظہر جیسے۔ نہ کہ مذہب سے۔ عزیزوں نے اصرار کیا تھا کھاتا پیتا گھر ہے، لڑکا کماتا ہے، پولس کا داروغہ ہے، خوش مزاج ہے، جانا بوجھا ہے، ذکیہ کو خوش رکھے گا۔ مگر..... مگر..... !"

اور مولانا پنجرے میں بند شیر کی طرح ٹہلنے لگے۔ ان کی نظریں اپنے غصہ کا شکار ڈھونڈ رہی تھیں۔ کوئی ایسی چیز جسے توڑ پھوڑ کر جسے پھاڑ کر، جلا کر

وہ اپنے دل کا بخار نکال سکیں۔ اور ان کی نظر ان چیزوں پر جا کر رُکی جو اظہر نے اپنی زندگی سے مایوس ہونے پر زکیہ کی یادگار کے طور پر ان کے پاس بھیجدی تھیں۔ کاٹھ کا صندوق، جہیز میں دی ہوئی وظائف کی کتابیں اور جزدان میں لپٹا ہوا قرآن۔ جب سے یہ چیزیں آئی تھیں مولانا نے انھیں کھول کر نہ دیکھا تھا کہ ان میں کیا رکھا ہے۔ وہ تیز قدم رکھتے ہوئے ان چیزوں کے قریب گئے اور انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے قرآن اُٹھا کر بستر پر رکھا۔ پھر انھوں نے اوراد و وظائف کی کتابیں اُٹھا کر ایک ایک کو دیکھنا شروع کیا۔ ایک کتاب کے آخر میں چند صفحے سادے لگے تھے۔ ان پر زکیہ کے ہاتھ کی تحریر دکھائی دی۔ معلوم ہوا آنکھوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ مولانا نے تکلیف سے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن ان کی سوکھی انگلیاں مُڑے ہوئے کاغذ کے کونے اسی طرح درست کرتی رہیں جس طرح ماں سوتے ہوئے بچے کی زلفیں سنوارتی ہے اور خود ان کا جسم اس طرح ہلتا رہا جیسے وہ پالنے میں کسی کو جھولا جھلا رہے ہیں۔ پھر انھوں نے سینے میں کھٹکتی ایک سانس لیکر آنکھیں کھولیں اور وہ زکیہ کی تحریریں پڑھنے لگے۔

"میرے نکاح کو آج تیسرا دن ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو جسمانی اذیت پہنچانے میں اپنے کو خوشی کیسے محسوس ہوتی ہے اور لوگ اس تقریب کو شادی کیوں کہتے ہیں؟۔

میرے سرتاج نوکری پر گئے۔ مجھے معلوم نہ ہو سکا انھیں کیا پسند ہے، کیا

ناپسند۔ میں پہلے ہی دن سے برابر دعا کر رہی ہوں کہ خدا مجھے انھیں کی پسند کا بنا دے! خواہ اس میں مجھے کتنی ہی اذیت تک پہنچے!

لوگ ساس نندوں کو بُرا کہتے ہیں۔ میری ساس نندیں تو مجھ سے اس قدر محبت کرتی ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی وہ مجھ ہی سے لینا چاہتی ہیں۔

آپا جان کو آج کل کھانا کون کھلاتا ہوگا؟ کلو شام ہی کو چلی جاتی ہوگی، اور وہ کھاتے ہیں رات گئے۔ انھیں گرم روٹیاں کیسے ملتی ہوں گی؟ کچھ نہیں، انھیں چاہیئے کہ وہ اپنا دوسرا نکاح کر لیں۔ بیٹی نہ ہو تو بیوی ضرور ہونا چاہیئے!"

مولانا نے رُک کر ایک لمبی سانس بھر لی۔ وہ تھوڑی دیر فضا میں گھورتے رہے۔ پھر انھوں نے ڈائری کے کئی ورق سرسری نظر ڈال کر پلٹ دیئے۔ شروع شروع میں دو دو چار چار جملوں میں بات کہہ دی جاتی تھی۔ اب پورے پورے صفحے رنگے ملنے لگے۔ گویا ابتدا میں زندگی کے کنارے پر پیراکی کی مشق کی جاتی تھی۔ پیرنے والی دو چار ہاتھ مارتی اور تھک کر پلٹ آتی۔ مگر اب وہ زندگی کی گنگا میں بھرپور اتر گئی تھی۔ دھارے کے خلاف بہت دور تک پیرتی ہوئی جاتی مگر ہمت کے بازو شل نہ ہوتے!

مولانا کی نظر دفعتہً ٹھٹھکی۔ اس نے لکھا تھا

رحیمن کو اور مجھے چچا جان تھانے پر پہنچا گئے۔ میرے سسرال نے ہماری بالکل اسی طرح پذیرائی کی جس طرح کوئی امیر کسی بڑی دعوت میں پلاؤ قورمہ کھانے کے بعد کسی غریب عزیز کے ہاں سے ٹھنڈی پوریوں کا حصہ اتارتا ہے۔ واپس بھی نہیں کی جاتی ہیں، کھائی بھی نہیں جاتی ہیں بس کسی چھینکے پر ڈال دی جاتی ہیں کہ پڑی سوکھیں!

عمو جان چند گھنٹے بعد چلے گئے۔ وہ بھلا بھتیجی کی سسرال میں کیسے ٹک سکتے تھے۔ اُن کو میری خوشی سے زیادہ اپنے دیہات کے رواج کا خیال تھا۔ اب یہ جو چچا جان کو اسٹیشن بھیجنے گئے تو دس بجے رات تک نہ پلٹے۔ نہ جانے کون سا کام نکل آیا۔ رحیمن سفر کے تکان سے چور تھی۔ میں نے اسے کھلا پلا کر سلا دیا۔ مگر خود انگیٹھیوں پر پتیلیاں رکھے بیٹھی رہی۔ جب ساڑھے دس بجے اندر آئے تو مجھے پتیلیوں کے پاس اکیلے بیٹھے دیکھا مگر کچھ بولے نہیں۔ میں نے گرم گرم کھانا سامنے رکھا تو پوچھا "تم نے کھایا؟"

میں نے کہا "میں آپ کے پہلے کیسے کھا لیتی؟"

جواب میں انھوں نے عجیب بات کہی، میں خاک نہ سمجھی۔ وہ بولے "اچھا، یہ رنگ ہیں بھئی: یہ رنگ!"

رحیمن دین ایمان کی باتوں سے بہت کم واقف ہے۔ آج مجھے اسے ٹوک کر کئی باتیں بتانا پڑیں ——

باہر کچھ شور سا ہو رہا تھا، وہ جھٹ باورچی خانہ سے نکل دروازہ کھول کر

جھانکنے لگی۔ میں نے کہا "رحیمن باہر نہ جھانکو، جھانکنے تاکنے کو بُرا کہا گیا ہے۔"

"وہ بولی "بٹیا، تم نے تو آنکھیں ہوتے انھیں بند کر رکھا ہے۔ اب کیا میں بھی تمھاری جیسی ہو جاؤں، کچھ نہ دیکھوں!"

میں نے کہا "بوا میری آنکھیں جو کچھ دیکھنے کے لئے بنی ہیں وہ میں سب دیکھتی ہوں۔ خود بنانے والے نے حکم دیا ہے اُن چیزوں کو مت دیکھو جو دوسرا چھپانا چاہتا ہے۔ جھانکنے والا کبھی اچھی چیز نہیں دیکھتا۔ نیکی ڈنکے کی چوٹ کی جاتی ہے، بدی ہمیشہ اوٹ میں کی جاتی ہے۔ تم جھانک کر دیکھو گی تو کبھی خوش نہ ہو گی!"

رحیمن میری باتیں تو پی گئی اور اس نے اپنی شک کا دہانہ کھول دیا۔ "بی بی! تم نہ جھانکو نہ تاکو، نہ دیکھو نہ سنو، نہ ٹوکو نہ بولو اور میاں ہیں کہ اُلٹ کر پوچھتے بھی نہیں!"

مجھے رحیمن کا یہ طعنہ بہت بُرا لگا۔ مرد اگر ہر وقت بیوی ہی کا مُنہ دیکھے گا تو وہ دنیا میں کام کر چکا۔ میں اُن کو اس طرح کا "بے کار" آدمی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کو دس کوس کے حلقے میں مجرموں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی، مقدموں، فوجداریوں، چوریوں، ڈاکوں میں تفتیش کرنا پڑتی۔ بارہ گھنٹے، سولہ گھنٹے وردی پہنے، پیٹی کسے ڈیوٹی دینا پڑتی۔ بھلا ایسے میں وہ ہر وقت میرے پاس کہاں بیٹھے رہتے اس لئے میں نے ذرا تیکھے پن سے کہا "بوا مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرتے ہیں۔ میں تو جانتی ہوں کہ جیسا ایک میاں کو ہونا چاہئے ویسے ہی وہ بھی ہیں۔ میں نے اس کے پہلے کوئی بیاہ

نہیں کیا کہ مجھے شوہر کے برتاؤ کے متعلق کوئی تجربہ ہو" میں یہ بھول گئی تھی کہ رحیمن اس وقت تک چار نکاح کر چکی تھی اور اب چونڈا پکنے پر بھی پانچویں کی تاک میں تھی۔ میں نے سادہ دلی سے ایک حقیقت بیان کر دی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوا جیسے رحیمن کے مرچیں سی لگ گئیں۔ وہ تلملا کر بولی "اے ہے بھولی بی بی! اتنا تو آپ بھی جانتی ہی ہوں گی کہ بیوی کے رہتے سہتے رنڈی نہیں رکھی جاتی، جو آپ کے میاں چھمی جان کو گلے کا ہار بنائے جگہ جگہ لئے پھرتے ہیں"

نہ جانے وہ کیا سمجھی تھی کہ چھمی جان کا نام لیکر وہ مجھے آپے سے باہر کر دے گی یا میں سوکن کے ذکر سے بدحواس ہو جاؤں گی، بیہوش ہو کر گر پڑوں گی۔ اس لئے کہ اس نے یہ فقرہ کہہ کر مجھے اس طرح گھور کر دیکھا جیسے اس نے بڑا تیر مارا۔ میں سچ کہوں مجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔

"ایک تو سنی سنائی باتوں پر یقین نہ کرنا چاہیئے۔ صحیح وہی چیز ہے جو اپنی آنکھ سے دیکھی جائے۔ سو نہ تم نے دیکھا نہ میں نے۔۔۔۔"

وہ بھونچکی ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "بھلا اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ خدا اور رسول کا حکم بھی ہے کہ اگر کسی پر تہمت دھری جائے تو اس پر یقین نہ کرو۔ پھر میں کہتی ہوں اگر یہ سچ بھی ہے تو انھوں نے چھمی جان سے نکاح کر لیا ہوگا۔ اختیار ہوتے وہ گناہ کیوں کرنے لگے!"

رحیمن سر ہلاتی باورچی خانہ میں چلی گئی۔ وہاں بیٹھ کر ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی "بیوی میں تم سے ہار گئی!"

میں کچھ نہ سمجھی کہ میں نے اس میں ہار جیت والی بات کون سی کہی۔ میں نے

وہی کیا جو مذہب کا حکم ہے۔ خیر، مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے رحیمن کو آج کچھ دین و ایمان کی باتیں بتا دیں۔

آج عجیب واقعہ ہوا۔ کوئی گیارہ بجے رات کو دو سپاہی انھیں سنبھالے ہوئے ڈیوڑھی پر لائے۔ رحیمن کو آواز دی پردہ کرواؤ، داروغہ جی کو اندر لائیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ یا اللہ کیا بات ہوئی جو آج سپاہی ان کو اندر لا رہے ہیں، کہیں چوٹ کھائی، کسی بیماری سے بیہوش ہیں کیا بات ہے۔ کس سے پچھواؤں کیا کروں۔ رحیمن ٹانگ پسارے "خراٹے" لے رہی تھی۔ اس کے سر پر کوئی ڈھول بھی بجتا تو اس کو خبر نہ ہوتی۔ مجبوراً خود اُٹھی برقعہ اوڑھ کر خود کنڈی کھول دی۔ وہ لوگ جب انھیں پلنگ پر لٹا کر چلے گئے تو میں نے آکر دیکھا۔ سارے کپڑے پہنے بیہوش سے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ میں نے چاہا جھک کر اُن کی اچکن کے بٹن کھول کر اسے اتار دوں تو اُن کے کھلے منہ سے ایسی بو آئی کہ سر چکرا نے لگا۔ میں نے سانس روک کر اچکن اتاری اور جوتا موزہ اتارا، بدن چھو کر دیکھا گرم نہ تھا، دل کی حرکت بھی ٹھیک تھی، ہاں نبض البتہ کچھ تیز چل رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون سی بیماری ہے۔ پھر خود ہی خیال آیا کہ اگر کوئی خدشے خطرے کی بات ہوتی تو سپاہی ضرور ڈاکٹر حکیم کو بلا لاتے۔ پھر بھی میں رحل پر سے اپنا قرآن اُٹھا لائی، اور میں نے اس کے پاک ورقوں کی انھیں ہوا دی۔ اور تحفۃ العوام میں جتنی دعائیں بیماریوں کی لکھی ہیں وہ سب پڑھ کر ان پر دم کر ڈالیں۔ لیکن بدبو سے میرا سر پھٹنے لگا۔ میں نے سوچا ان بیچارے کی کیا حالت

ہو گی جو اس وقت بیمار بھی ہیں۔ اس لئے میں نے ان کے سر میں بہت سا ریڈی کلون لگا دیا اور اُن کے کپڑوں میں، تکیوں میں، چادر میں پوری شیشی عطر پوت ڈالا۔ رات بھر میں جاگتی رہی۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ نہ جانے کیسے کیسے برے خیالات آتے تھے۔ بار بار دل کو ڈھارس بندھاتی رہی کہ اللہ موجود ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا۔ وہ جو کچھ کرے گا بہتر ہی ہو گا۔

صبح کو جب وہ اُٹھے تو بڑی دیر تک انگڑائی لے لے کر جسم توڑتے رہے۔ میں نے چاہا ہاتھ پاؤں دبا دوں کسل دور ہو جائے مگر انھوں نے ہاتھ رکھتے ہی اسے الگ کر کے کہا "کیا درد اور بڑھانا چاہتی ہو؟"

میں بھونچکا سی ہو گئی۔ میری ساس نے ہر شام پنڈلیاں دباتے وقت کہا "جیتی رہو بیٹی، جہاں تم ہاتھ لگاتی ہو جسم کا درد کافور ہو جاتا ہے" وہ اور جھٹلانیاں۔ تندیں سب ہی تو میرے ہاتھ کی نرمی، سبکی، اور صفائی کی تعریفیں کرتی ہیں۔ مگر ان سبکی پسند بیکار۔ جس کی خدمت کے لئے یہ ہاتھ بنے ہیں ان کو تو نہیں بھاتے۔ ان کے جسم کا درد تو ان سے بڑھتا ہے! مگر قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ سکوں وہ اُٹھ کر باہر چل دیے۔

جاتے وقت جب وہ رحیمن کے پاس سے گزرے تو اس نے ان کی طرف گھور کر کہا "وہ لھا میاں شرم تو نہیں آتی!" اور انھوں نے اس کی بدتمیزی پر نہ اُسے ڈانٹا، نہ پھٹکارا بلکہ سر اور نہوڑا لیا۔ میرا جی چاہا میں رحیمن سے پوچھوں کہ یہ کہنے کی شرم دلائی جا رہی ہے۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے! خدا تو رات بھر پڑی ہوتی رہیں۔ ان کے دشمنوں کی کیسی تو حالت تھی، کیسے بے سُدھ پڑے رہے، نہ

دین کی خبر، نہ دنیا کی۔ اور اس وقت اپنی بے پروائی پر شرمانے کی جگہ ان کو شرم دلانے لگیں۔ لیکن فوراً خیال آیا ہوگا ان دونوں کے درمیان کوئی معاملہ نہیں تو وہ یوں چپ سادھے کیوں چلے جاتے۔ اس لئے میں نے زبان روک لی۔ مجھے کسی کے بیچ میں بولنے کا کیا حق تھا؟

آج دیوالی کی رات ہے۔ شام سے چاروں طرف مکانوں پر دیئے جل رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تھانے پر بھی چراغاں ہے۔ مردانے میں بہت سے لوگ آئے ہیں۔ سنتی ہوں کہ آس پاس کے بڑے بڑے زمیندار بھی اکٹھا ہیں۔ آج بڑے کھیل تماشے ہوں گے۔

مجھے صبح ہی حکم ملا تھا۔ آج دعوت کے کھانے پکیں گے۔ میں نے رحیمن کے ساتھ مل کر کوئی بیسیوں طرح کی چیزیں تیار کر دی ہیں۔ مرغ مسلم، شامی کباب، گولے سیخ، پلاؤ، زردہ، قورمہ، قلیہ، مچھلی کا قورمہ، مچھلی کے کباب، چھلی ہوئی روٹیاں، پوریاں، پراٹھے، باقر خانی، بادام کا حلوہ، پستے کی لوزیں، شاہی ٹکڑے، شکر قند کی کھیر، ترکاریوں میں آلو، گوبھی، بھنڈی، شلجم، ٹماٹر، پرول جو اس دیہات میں مل سکا ہے یا شہر سے آسکا ہے، سب کچھ پکا ڈالا ہے۔ کیا معلوم کہ ان کے دوستوں کو کیا پسند ہے۔ اب فکر ہے تو یہی کہ ان تمام نعمتوں میں ان کو بھی کوئی چیز پسند آتی ہے یا نہیں۔ ابا جان کو میری پکائی ہوئی دال روٹی میں بھی مزہ آتا تھا، خدا جنت سوادت کرے اور وہ کبھی ایک آدھ چیز کیا چٹخارے لے لیکر کھائیں!—

میں یہ لکھ رہی تھی کہ رحیمن چیخی۔ میں دوڑی کہ کیا آفت آ ئی۔ وہ صحن میں کھڑی کوس رہی تھی۔ "موؤں کا ہیا ؤ تو دیکھو، پولس والوں کا تھانہ ہے، سیکڑوں آدمی باہر کا بھی موجود ہے، رات کے ابھی گیارہ بجے ہیں اور ابھی سے لگے ڈھیلے پھینکنے۔

میں نے کہا "کون ڈھیلا پھینک رہا ہے؟"

وہ بولی "چور!"

مجھے ہنسی آگئی۔ اس بڑھیا کی بھی کیسی مت ماری گئی ہے۔ بھلا ہمارے ہاں تھانے میں چوروں کا کیا گزر؟ مانا کہ میں جس مکان میں رہتی ہوں اس کے پیچھے کھیت ہی کھیت ہیں اور ادھر کی دیوار بھی کچی اور نیچی ہے مگر سب جانتے ہیں کہ یہ مکان تھانے ہی کا حصہ ہے اور وہاں چور پکڑنے والے رہتے ہیں، چوری کرانے والے نہیں رہتے۔ بھلا کیسے کسی چور کی ہمت پڑ سکتی ہے کہ ڈھیلے پھینکے یا یہاں سے ہاتھ ساسینہ لگائے۔ مگر رحیمن کا اصرار ہے کہ ڈھیلے چوروں ہی نے پھینکے ہیں۔

اس نے کہا "ارے بی بی، تم کیا جانو، دیوالی میں چور بھی اپنے اپنے دیوتا جگاتے ہیں۔ اگر آج کی رات وہ چوری کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر سال بھر جس جس کو چاہیں موس لیں، کوئی ان کا بال بانکا نہیں کر سکتا۔"

مجھے یقین نہیں آتا کہ چور بھی دیوی دیوتا کو مانتا ہوگا۔ اگر اسے ان پر یقین ہوتا تو وہ چوری ہی کیوں کرتا۔ اسے جس نے پیدا کیا ہے وہ تو ہر جگہ ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے۔ پھر اس سے کوئی چھپ کر کہاں چوری کرے گا۔ اور چوری کرکے

جائے گا کہاں ؟ کسی اور نے کوئی جگہ بنا رکھی ہے جہاں اسے پناہ ملے گی ؟ میں جب ان باتوں کو سوچتی ہوں تو مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ دنیا کے پونڈے پک گئے مگر اس میں رہنے بسنے والے اب بھی بچے ہی ہیں اور بچوں ہی جیسی حرکتیں کرتے ہیں۔

ان کی بھی عجیب باتیں ہوتی ہیں۔ جیسے میں اُن سے بھی اپنے روپے پیسے، گہنے پاتے عزیز رکھتی ہوں۔ جو کچھ ہے وہ انھیں کا تو ہے۔ میرے بکس میں رکھنے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ جب میں ان کی، میری جان ان کی، میرا دیا ان کا تو پھر میری چیزیں میری کیسے رہ سکتی ہیں۔ سب کچھ ان کا ہے۔

لیکن بعض وقت وہ ایسا تکلف برتتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انھیں شک ہے کہ میں یا میری چیزیں بالکل انکی نہیں ہیں۔ رات ہی کی باتیں دیکھئے۔ ایک مرتبہ تو سو روپے خود مانگ کر لے گئے دوسری بار گہنوں کا صندوقچہ مجھ سے چھپا کر جو لے جانے لگے تو ایسے گھبرائے کہ گر پڑے۔ مجھے اب بھی ان کی حرکت پر ہنسی آتی ہے۔

ہوا یہ کہ رات کو کوئی گیارہ بجے جب سب لوگ کھانا وانا کھا چکے تو وہ باہر ہی اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ میں نے عشاء نوافل کے ساتھ پڑھی اور سو رہی۔ کوئی تین بجے ہوں گے کہ وہ دبے پاؤں اندر آئے۔ مگر میں آہٹ سے جاگ گئی۔ ان کے چہرے پر عجیب گھبراہٹ سی تھی۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ کوئی جواب نہ دیا بلکہ میرے پلنگ کی پٹی پر آکر بیٹھ گئے۔ میں اُٹھنے لگی

تو بولے" نہیں، تم لیٹی رہو"

پھر خود ہی میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر بولے" تمھارے پاس کچھ روپئے ہیں؟"

میں نے کہا" ہیں، کیوں نہیں؟"

بولے "کتنے"

میں نے کہا" پورے ایک سو!"

کہنے لگے "کہاں ہیں؟"

میں نے کہا" بکس میں ہیں۔ نکال دوں؟"

بولے" نہیں، کنجی دیدو، میں نکال لوں گا"

میں نے سرھانے سے کنجی اُٹھا کر دیدی۔ انھوں نے بکس کھولا روپئے نکالے اور کنجی لئے ہوئے چلے گئے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ مجھے اس وقت کیسی خوشی ہوئی۔ ابا جان نے جو ہاتھ روک کر خرچ کرنے کا سلیقہ سکھایا تھا اور کچھ نہ کچھ بچا کر رکھ چھوڑنے کی تاکید کی تھی وہ کیسے موقع پر کام آئی۔ میں نے ٹھانے پر آنے کے بعد گھر کے خرچ سے دس دس پندرہ پندرہ روپیہ مہینہ کر کے جو بچایا تھا وہ آج اُن کے کام آیا۔ ان کو دے کر انھیں خوش کیا، اس سے بہتر میری اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا، صبح اُٹھتے ہی دو رکعت نماز شکر ادا کرنا طے کیا اور میں سو رہی۔

ایک گھنٹہ بعد پھر آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ مرغ بول رہے تھے، جھٹ پٹے سے پہلے کا دھندلکا تھا، ان کا چہرہ اچھی طرح سے دکھائی نہ دیتا تھا، مجھ پر بھی

نیند کی کسل تھی، بولا نہ گیا، میں چپکی لیٹی رہی - وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے اس کمرے کی طرف گئے جہاں گہنوں کا صندوقچہ تھا۔ اور اُسے اُٹھا کر میرے پلنگ کی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے چلے۔ مجھے بیساختہ ہنسی آگئی — ہنسی کی بات ہی تھی۔ چھ فٹ کا مرد، جب اپنے ہی گھر میں بلی کی چال چلے، اور اپنی ہی چیز لے جانے میں اس طرح کی حرکت کرے کہ معلوم ہو کہ کسی کی چوری کر رہا ہے تو ہنسی آئے یا نہ آئے لیکن میری ہنسی بے موقع ثابت ہوئی - وہ ایسا گھبرائے کہ سامنے ہی رکھی ہوئی میز انھیں نہ دکھائی دی۔ وہ اس کے پائے سے اُلجھے اور صندوقچہ سمیت فرش پر گر پڑے۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میری بے ساختہ ہنسی سے ان کے چوٹ لگی۔ لیکن جب تک میں کہتی پلنگ سے اُٹھوں اُٹھوں کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی، وہ جلدی سے صندوقچہ اُٹھا کر باہر بھاگ گئے! —

میں بڑی دیر تک اُن کے اس بھاگنے پر ہنستی رہی۔ اس بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا کوئی شخص اپنی ہی چیز چُرا سکتا ہے؟

آج مجھے یقین ہو گیا کہ رحیمن جو ان کو طرح طرح سے بدنام کرتی ہے وہ سراسر جھوٹ اور غلط ہے۔ وہ واقعی بڑے سیدھے سادے شریف انسان ہیں کوئی بدطینت آدمی اپنے کئے پر پچھتاتا نہیں۔ پھر کوئی کتنا ہی بڑا قصور کرے اگر اس نے توبہ کر لی تو پھر تو وہ اتنا ہی گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے جتنا کہ دودھ پیتا گود کا بچہ۔

آج ہی کی بات کو لے لیجئے۔ صبح جو وہ گنوں کا صندوقچہ لے کر بھاگے تو دس بجے دن تک گھر میں نہ آئے۔ باہر کی آوازوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے بارات کے ساتھی ایک ایک کر کے چلے گئے مگر وہ پھر بھی اندر نہ آئے۔ میں نے سمجھا کسی کام میں ہوں گے۔ رحیمن سے کہا "بچھوا لو، ناشتہ باہر ہی بھیجدیا جائے یا اندر آکر کریں گے"۔ مگر وہ تو سیدھی بات کرنا جانتی ہی نہیں۔ اپنے مالک کو بھی ڈانٹنے اور نصیحت کرنے کا اپنے کو حقدار سمجھتی ہے۔ بڑبڑائی ہوئی اُٹھی اور ڈیوڑھی پر جا کر اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ شاید وہ اکیلے ہی تھے۔ اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے ڈانٹا ——— "واہ دُولہ میاں واہ! آپ یہاں اکیلے بیٹھے مکھی مار رہے ہیں اور وہاں بٹیا ناشتہ لئے بیٹھی ہیں!

مجھے رحیمن کا یہ انداز بہت بُرا لگا۔ وہ نوکرانی تھی۔ اور وہ اس کے آقا۔ ہیں، بیوی تھی اور وہ میرے سرتاج۔ ہمارا تو کام ہی تھا کہ ہم ان کی خوشی دیکھیں۔ ان کی فرصت کا انتظار کریں۔ یہی ہماری عین راحت ہے، یہی ہماری جنت! مگر قبل اس کے کہ میں رحیمن کو ٹوکوں وہ خود ہی سر جھکائے اندر چلے آئے۔ ان کی چال اتنی سست تھی کہ جان پڑتا تھا کوسوں کا چکر لگا کر آرہے ہیں۔ میں نے لوٹے، منجن، صابون، مسین کی طرف اشارہ کیا "ذرا منہ ہاتھ دھو ڈالئے رات بھر جاگے ہیں، کچھ کھا کر آرام کیجئے"۔

مگر وہ کچھ بولے نہیں، مجھے بڑی حسرت سے دیکھا۔ اور اپنے پلنگ پر جا کر گر پڑے۔ میں گھبرا کر جلدی سے پاس پہنچی، انھوں نے کروٹ لیکر منہ پھیر لیا۔

میرا کلیجہ مُنہ کو آگیا۔ ہو نہ ہو، مجھ سے کسی بات پر ناراض ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پنڈلی دبانے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ انھوں نے ٹانگیں کھینچ لیں اور مجھے زبردستی پلنگ پر بٹھا کر میری گود میں سر رکھ کر بولے "میں تمھارا قصوروار ہوں، میں نے تمھارے سارے گہنے کھو دئے! مجھے سچے دل سے معاف کر دو!"

مجھے ہنسی آگئی۔ میرا مرد بھی کتنا بھولا ہے۔ جیسے وہ گہنے میرے ہی تو تھے! انھوں نے گھبرا کر مجھے دیکھا۔ میں نے زبردستی تیوری بنا کر کہا "وہ گہنے پہنتی میں ضرور تھی، مگر تھے وہ آپ ہی کے! اگر آپ نے انھیں کسی کو دیدیا تو آپ کی خوشی۔ میں آپ کے سر عزیز کی قسم کھاتی ہوں میں اس حالت میں بھی اتنی ہی خوش ہوں جتنی کہ پہلے تھی!"

میرے اس کہنے پر بھی ان کے چہرے پر افسردگی کے آثار موجود پائے بلکہ اب ان میں شرمندگی کی جھلک بھی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ میں کون سی بات ایسی کہوں یا کروں جس سے ان کے چہرے پر سے رنج کی جگہ خوشی کی لہریں دوڑنے لگے۔ انھوں نے جو معافی کی لفظ استعمال کی تھی اس نے مجھے ایک ایسی بات یاد دلادی جس کی ہر مرد کو اپنی بیوی کی طرف سے فکر ہوتی ہے اور جس کے متعلق میں پہلے ہی دن سے دل میں ٹھانے بیٹھی تھی کہ میں اُن سے ضرور کہوں گی۔ آج تک کہنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ آج ان کو اس طرح اپنی گود میں سر رکھے دیکھ کر وہ بات یاد آگئی۔

میں نے ان کے سر کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا "میں نے سچے دل سے اپنا مہر آپ کو معاف کیا!"

وہ اس طرح اچھل پڑے جیسے میری بات ان کے دل پر گھونسا بنکر لگی۔

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھ کر بولے "ذکو، مولانا جو تمھیں کہتے ہیں اس کا مجھے بھی آج یقین آگیا۔ تم واقعی جنتی حور ہو!" اور وہ میری گود میں منہ چھپا کر سسکنے لگے!

رحیمن کہتی ہے تم نے اپنے میاں پر جادو کر دیا ہے۔ اور حکیمی جان نے تم پر۔ سب سے پہلے الزام کی وجہ وہ یہ بتاتی ہے کہ دیوالی کے دن والی گفتگو کے بعد ہی حکیمی جان نکال دی گئیں۔ باہر کا بیٹھنا، آدھی آدھی رات تک گھومنا ترک کر دیا گیا۔ اب جب بھی سرکاری کاموں سے فرصت ملتی ہے وہ میرے ہی پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ اور مجھے اس اس طرح گھورتے ہیں کہ مجھے ہنسی آجاتی ہے، کبھی میں شرم سے پسینے پسینے ہو جاتی ہوں۔ سچ مچ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے آنکھوں کے ذریعہ کھا جانا چاہتے ہیں، سینے میں رکھ لینا چاہتے ہیں۔ خود کہتے ہیں میں اندھا تھا اب آنکھیں کھلی ہیں۔ تمھیں نے ان نینوں میں نور ڈالا ہے، تمھیں سے آنکھیں لڑاتا ہوں، تمھارے ہی حسن سے آنکھیں سینکتا ہوں، تمھیں کو دیکھ کر آنکھوں میں روشنی بڑھتی ہے، جی ہی نہیں بھرتا۔ ـــــ نہ جانے اور کیا کیا کہتے ہیں۔ مجھکو ان کی چلتی ہوئی زبان روکنے کے لئے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دینا پڑتا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ اللہ سب کو ایسا ہی چاہنے والا میاں دے!

دوسرے الزام کی وجہ رحیمن یہ بتاتی ہے کہ حکیمی جان کے جانے کے ساتویں دن میرے ہاں اسقاط ہوا۔ اور اس وقت سے جو طبیعت بگڑی ہے، تو سنبھلنے ہی کو نہیں آتی۔ گاؤں کی چماروں نے خوب پیٹ ملا، شہر سے

دائی بھی آئی اور ہفتوں رہ کر اور اپنی ساری ترکیبیں کر کے ہار کر چلی گئی۔ حکیم، وید، ڈاکٹر سب ہی آ گئے مگر نہ کھانسی جاتی ہے، نہ حرارت۔ کل ڈاکٹرنی آئی تھی۔ کہتی تھی تم کو نسوانی خرابی سے دق ہو گئی ہے بھوالی جانا پڑے گا۔ میں نے کہہ دیا میں نہ جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے موت مقررہ وقت پر آئے گی۔ نہ ایک لمحہ بعد نہ ایک لمحہ پہلے۔ پھر میں اس کے قدم کیوں چھوڑوں جس کی وجہ سے زندگی جنت ہے! مرنے کے بعد وہ ملنے کی نہیں۔ میری جیسی گنہگاروں کا وہاں کیا گزر۔ پھر میں آدھی چھوڑ کر ساری کے پیچھے کیوں دوڑوں؟

ہاں، ایک سوہانِ روح ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ موئی بیماری ایک سے دوسرے کو ہو جاتی ہے۔ میں لاکھ چاہتی ہوں وہ مجھ سے الگ رہیں۔ اپنے کھانے کے برتن، گلاس، کٹورا، چارکی پیالی، بستر، تولیہ ہر چیز الگ کر لی ہے۔ رحیمن پر تاکید رکھتی ہوں کہ میری استعمال کی ہوئی چیزیں اُن کے پاس نہ پہنچنے پائیں۔ لیکن وہ ہیں کہ ہر وقت لئے ہی رہتے ہیں۔ میری ہر چیز اس طرح استعمال کرتے ہیں جیسے مجھے کوئی بیماری ہی نہیں۔ اندر آئیں گے تو جھٹ میرے پلنگ پر بیٹھ جائیں گے۔ رات کو سوئیں گے تو مجھے گودی میں لیکر سوئیں گے۔ کھانے کھا لیتے اُٹھ جاؤں گی تو برابر بیٹھ سہلائیں گے، تولیہ سے منہ پونچھتے رہیں گے، اور کھانسی رُکے گی تو منہ چوم لیں گے!۔

بس خدا سے ہر وقت دعا ہے کہ وہ ہر طرح کی بیماری آزاری سے محفوظ رہیں۔ اے میرے اللہ اپنی گنہگار بندی کی اتنی سی بات سُن لے!

مولانا کے آنسوؤں نے اُن کا پڑھنا بند کر دیا۔ اور اب پڑھا ہی کیا تھا۔

مصنف نے کتاب کی آخری سطریں لکھ دی تھیں۔ اور آج اظہر نے مرکر تمت بالخیر کا فقرہ بھی بڑھا دیا تھا!۔۔۔۔۔ ساحل پر کھیلنے والے دونوں بیر آج دریا پار کر چکے تھے! زندگی کی آنکھوں سے گرے ہوئے آنسوؤں کے دو قطرے سرچشمے میں جا کر مل گئے تھے! اور ذکو کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا کیوں قبول نہ ہوئی اس کا مولانا کے پاس کوئی جواب نہ تھا — اور مولانا کو ایسا محسوس ہوا جیسے ذکو اپنے دل نشیں انداز میں ان سے کہہ رہی ہے "ابا جان! اباجان، ملاقات کی بھوکی روح اپنے ہمدم کو پاس بلا لینے میں کامیاب ہو گئی۔ ہم جدائی کے زخم کو ناسور میں بدلنا نہ چاہتے تھے، ہماری جنت ایک دوسرے کے ساتھ ہی رہنے میں ہے!۔۔۔ اور ابا جان! جسے میں اچھا سمجھتی تھی اسے آپ بُرا سمجھنے والے کون؟ اور جسے آپ نے گناہ کرتے نہیں دیکھا، اس کے گناہگار ہونے کا آپ کو یقین کیسے؟

اور مولانا اجتبیٰ کو خیال آیا اظہر کی لاش مسجد کے سامنے اب بھی رکھی ہے اور لوگ منتظر کھڑے ہیں کہ امام آئے تو نماز پڑھی جائے۔ اور وہ لپکتے ہانپتے سسکتے گھر سے نکلے اور صفوں کے آگے کھڑے ہو کر انھوں نے ہاتھ اٹھا کر گواہی دی:-

"سب کے بخشنے والے، ہم اس میت کے بارے میں سوائے نیکی اور بھلائی کے کچھ نہیں جانتے!"

وُووَا

اصل میں ان کا نام عبدالودود خاں تھا۔ وہ بزرگوں کے ناموں اور بچوں کے دادا تھے۔ لڑکوں نے ان کے نام و رشتے میں قطع و برید کی اور وہ عبدالودود دادا سے "دودو دا" ہو کر رہ گئے۔ فطرت نے بھی ان کے معاملے میں کچھ تحریف و تخفیف ہی سے کام لیا تھا۔ ان کی قامتِ بلند، پانچ فٹ سے بھی کم ہی تھی، اس پر دبلے پتلے اتنے کہ معلوم ہوتا اکہری ہڈی کا چلتا پھرتا ڈھانچہ ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں پتلی سی گردن، بڑا سا سر، ایسا معلوم ہوتا جیسے سہری کی چھڑ میں کسی نے مرادآبادی تربوز ٹھونس کر کھڑا کر دیا ہے۔ سر کی حجامت کو ان کے پتے دار بالوں نے ادھ بڑھا دیا تھا۔ تعجب ہوتا تھا کہ ان کی نازک گردن پر اتنا بڑا سر کیسے تھما ہے۔ پیشانی چوڑی اور کشادہ، بھنوئیں پتلی، کمان کی طرح جھکی ہوئی۔ آنکھیں چھوٹی مگر چمکتی ہوئی، ناک مختصر، اس کا سرا کچھ اوپر کو اٹھا ہوا۔ ہونٹ پتلے اور پھڑکتے ہوئے۔ آواز میٹھی، سریلی مگر نتھنوں کا زیر ان میں شریک تھا۔ لاغر جسم جگہ جگہ سے ٹیڑھا، چہرے سے بڑی ذہانت ٹپکتی تھی۔ مگر یہ سارا سراپا مضحک تھا۔ ہمیشہ کرتا یا قمیص اور ایک بر کا پائجامہ پہنتے۔ کندھے پر ایک بڑا سا رومال ڈالے اور کان میں ایک چھوٹی سی پنسل کھونسے رہتے تھے۔

وہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان بولتے تھے۔ ان کا لب و لہجہ دیہات والوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ اس لئے ان کا اس طرح گاؤں والوں سے رشتہ قائم کرلینا تعجب خیز تھا۔ ان کا محمد پور کے کسی خاندان سے لگاؤ نہ تھا۔ وہ یہاں کب اور کس لئے آئے۔ شہر چھوڑ کر دیہات میں کیوں بس گئے، بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ شاید کسی رئیس زادے کی ابتدائی تعلیم کے لئے لکھنؤ یا اس کے مضافات سے بلائے گئے تھے۔ یا کسی زمیندار کے مصاحب بنکر آئے تھے۔ اور یہاں آکر کسی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ کوئی بات ٹھیک طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ دیکھا گیا تو یہی کہ میر انور حسین کے مردانے حصہ مکان میں عمر بھر رہے۔ اور کھانا انھوں نے میر احمد حسین کے یہاں کھایا۔ ان دونوں نے ان کے ساتھ یہ مراعات کیوں برتی، نہیں معلوم۔ ان کے یہاں اب بھی دو چار لڑکے قرآن پڑھنے اور اردو کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ مگر یہ لڑکے زمینداروں کے نہ ہوتے تھے۔ ان کے بچوں کو پڑھانے کے لئے ان کے گھروں پر الگ الگ مولوی رہتے تھے۔

"دودودا" دھنیئے، کنجڑوں، جولاہوں کے بچوں کو خدا کا نام لینا سکھاتے تھے۔ گاؤں میں طبقات کی حدیں بڑی سختی سے متعین تھیں۔ سادات زمیندار تھے۔ حاکم تھے۔ باقی سب رعایا پرجا۔ برہمن اور چھتری تو ان کے سامنے اور ان کی اجازت سے پلنگ اور تخت پر بیٹھ سکتے تھے۔ باقی اور قومیں، خواہ مسلمان ہوں یا ہندو، سب کو زمین پر اکڑوں بیٹھنا پڑتا تھا۔ ایسی حالت میں رعایا پرجا سب چھوٹی قوم، تھی

ان کے لڑکوں کے ساتھ گاؤں کے رئیسوں کے لڑکے کیسے پڑھ سکتے تھے

اور ایک ہی معلم ان کو کیسے ایک ساتھ تعلیم دے سکتا تھا۔ اس لئے دودا کی مدرسی چھوٹی قوم ہی تک محدود تھی۔ اور انھیں کے دو دو چار چار آنے مہینے کی نذر سے ان کا جیب خرچ چلتا تھا۔

مگر ان کی آمدنی کا یہی ایک ذریعہ نہ تھا۔ وہ گاؤں کے سب سے اچھے بڑھئی، لوہار اور صناع تھے۔ ان کا علم فارسی اُردو کی ابتدائی کتابوں تک محدود تھا۔ لیکن ان کا ہنر اکثر حدوں کو پار کر گیا تھا۔ نہ تو انھوں نے ریاضی سیکھی تھی، نہ سائنس اور نہ کسی انجینیرنگ کالج یا آرٹ اسکول کا منھ دیکھا تھا۔ مگر نئی نئی مشینوں کا ایجاد کرنا، پرزوں کا ڈھالنا، ان کی ڈزائین بنانا، ان کے سانچے ڈھالنا، یہ ان کا رات دن کا مشغلہ تھا۔

گاؤں میں لوہے کی گڑھاریاں انھوں نے ایجاد کیں۔ ان کے پہلے کاٹھ کی گڑھاریاں کاٹھ کے ڈنڈوں میں کھسی ہوئی ریں ریں کر کے چلتی تھیں۔ اور سال میں دو تین بار ضرور ٹوٹ جاتی تھیں۔ کسانوں اور زمینداروں دونوں کے یہاں یکساں حالت تھی۔ دودا نے اس تکلیف کو محسوس کیا۔ پہلے پنسل کاغذ لیکر ڈزائین بنائی۔ پھر سانچے تیار کئے۔ اور گاؤں کے لوہار کو بلا کر کچھ ہدایتیں دیں۔ اس کی بھٹی میں کئی گھنٹے خود بھی صرف کئے اور تیسرے ہی دن میرا نور کے کنویں پر لوہے کی گڑھاری لوہے کی سلاخ پر دکھائی دینے لگی ہر شخص نے اسے چلا کر، اس پر پانی کھینچ کر، ہر طرح آزما کر دیکھا۔ اور اسی ہفتے کے اندر گاؤں کے دس کنوؤں پر لوہے کی گڑھاریاں لگا دی گئیں۔ دودا کو اس ایجاد سے کیا فائدہ ہوا، اس کا اندازہ مشکل ہے کسی نے دو تین روپئے نقد

دیئے۔ کسی نے چار پانچ سیر مٹر حاضر کی۔ کسی نے دو تین سیر گیہوں۔ مگر وہ بیچارے اپنی ایجاد کو بازار تک نہ پہونچا سکے۔ اور نہ انھوں نے اسکو پیٹنٹ کرایا۔ ہندوستان میں نقالوں کی کمی نہیں۔ تقریباً ہر قصبے اور دیہات کے لوہار نے ان کی ایجاد سے فائدہ اٹھایا۔ ان کو سوائے گاؤں والوں کے کسی اور نے کچھ نہ دیا۔

ایک دفعہ خیال آیا کہ مکان میں جو پختہ حوض ہے اس کے صاف کرنے اور پانی نکالنے کے لئے مزدور لگانا پڑتے ہیں۔ یہ کام بغیر پیسہ خرچ کیئے خود اپنے ہاتھوں سے ہو سکتا ہے۔ دودا نے چند ٹین کے ٹکڑے جمع کیئے۔ ان میں کچھ چھوٹے بڑے پرزے لگائے اور ایک نلی بنا کر حوض میں داخل کر دی۔ اب دودا حوض کے کنارے بیٹھے اُلٹے ہاتھ سے ٹین کو دبائے ہیں اور داہنا ہاتھ ایک دستہ گھما رہا ہے اور پانی کی ایک پتلی ٹونٹی حوض سے باہر گر رہی ہے۔

گاؤں بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ دودا نے ایک کل ایجاد کی ہے۔ چھوٹے بڑے بوڑھے جوان سب تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ کوئی تعجب کا اظہار کر رہا ہے۔ کوئی اپنے طور پر تعریف کر رہا ہے۔ کوئی مذاق اڑا رہا ہے جتنے منھ اتنی باتیں اور جیسی عقل ویسی باتیں۔ ایک صاحب جو ہم عمر تھے۔ انھوں نے مسکرا کر پوچھا "یہ آپ اس کی دم کب تک اینٹھتے رہیں گے۔ پانی اگر اسی رفتار سے نکلے گا تو حوض کے خالی ہونے میں کئی دن لگیں گے!"

دودا کا مہ سوکھا چہرہ جس پر اس وقت ہلکی ہلکی سرخی دکھائی دے رہی

تھی، بالکل سیاہ پڑ گیا۔ انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔ "صاحب، یہ صرف مشین کا چھوٹا نمونہ ہے۔ حوصلہ ہو تو دام خرچ کیجئے۔ بڑی مشین بنا دوں۔ گھنٹہ بھر میں حوض تو کیا، پورا کنواں نہ خالی ہو جائے۔ جب ہی کہئے گا۔"

مگر گاؤں میں حوصلہ ہی کی تو کمی تھی۔ نہ تو کوئی سرمایہ دار تھا اور نہ کوئی دودا کی اُپج سے فائدہ اُٹھانے والا تھا۔ نہ کسی رئیس کی سرپرستی حاصل تھی اور نہ اپنی حکومت ہی تھی کہ وہ سر پر ہاتھ رکھتی۔ لے دے کے جب کسی کو سوجھتی تو بس یہی کہ ابکی جوڈیشل صاحب کا پڑاؤ ہمارے یہاں پڑے گا۔ تو اب کی یہ 'کھلونے' ان کو ضرور دکھائیں گے۔ دودا اس کھلونے کے لفظ پر تپ جاتے تھے۔ ان کا چہرہ تانبے کے رنگ کا ہو جاتا تھا۔ ان کے ہونٹ کانپنے لگتے تھے۔ اور وہ ہر مرتبہ ایسے لفظوں پر آسمان کی طرف دیکھتے اور ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھرتے تھے۔ گویا فیضی کی طرح فرمایا کرتے "قدر دانی عالم بالا معلوم شد"

دودا نے ایک پنکھا بھی ایجاد کیا تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں اکثر زمینداروں کے ہاں کاٹھ کے پنکھے کپڑے سے منڈھ کر اور جھالر لگا کر کمروں میں لٹکا دیتے تھے۔ ان کی ڈوریاں دروازوں کے اوپر ایک سوراخ سے نکال دی جاتی تھیں۔ گاؤں کے کہار، چمار، پاسی، جو زمینداروں کی زمین پر بسے ہونے کی وجہ سے پرجا کہلاتے، ان پنکھوں کو دن دن بھر کھینچتے اور شام کو دو چار پیسے مزدوری پاتے تھے۔ دودا نے کبھی اسی جاگیرداری نظام میں آنکھیں کھولی تھیں۔ اس لئے ان کو اس بیگار میں کوئی خاص خرابی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ان کو جو بات کھلتی تھی، وہ یہ کہ جو کام مشین سے نکل سکتا ہے، وہ انسان سے کیوں لیا جاتا ہے؟

اس لئے انھوں نے پنکھا بھی ایجاد کیا۔ سارے پنکھے گھومتے ہیں۔ ان کا پنکھا کاٹھ والے پنکھوں کی طرح بالکل سیدھا چلتا تھا۔

ان کو اپنی اس ایجاد پر بڑا فخر تھا۔ چنانچہ اُس سال جب موسم سرما میں ضلع کا کلکٹر دورہ کرتا ہوا گاؤں آیا، تو وہ اپنی ڈیزائنوں کی کاپی اور اپنا پنکھا لیکر اُس سے ملے۔ صاحب نے مختلف آلات کی ان کی ڈزائنیں دیکھیں۔ ان کے پنکھے کو چلا کر تجربہ کیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اور اس نے اُن سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان تمام ڈزائنوں کی نقل دے دیں۔ تاکہ وہ اسے انگلستان بھیج دے۔ مگر وہ ڈزائنوں کی نقل کا نام سُنتے ہی بھڑک اُٹھے۔ "واہ صاحب واہ! دماغ سوزی سے ایجاد کروں میں اور فائدہ اٹھائیں صاحب لوگ۔ میں ایسا بیوقوف نہیں کہ اپنی ڈیزائنیں دے دوں!" وہ اپنی کاپی بغل میں دبا کر خفا خفا واپس چلے آئے۔ جب کبھی بھی کوئی ان سے کلکٹر صاحب سے انٹرویو کا نتیجہ پوچھتا تو وہ کہتے۔ جناب میں ان کی گٹ پٹ تو سمجھتا نہیں، مگر وہ چاہتے تھے کہ میں انھیں اپنی ڈزائنیں دیدوں۔ قاہرہ سے، قرطبہ سے، بغداد سے، دمشق سے، دلی سے، ڈھاکہ سے نہ جانے کیا کیا لوٹ کر کرلے جا چکے ہیں۔ اب چاہتے ہیں کہ جو بچی کھچی ایجادیں ہمارے دماغوں میں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی اڑا لیجائیں۔ مجھ سے میری ڈیزائین کی نقلیں مانگتے تھے۔ بڑے ہوشیار، ہونہہ!

لوگ سمجھاتے۔ "اگر انگریزوں کو کوئی ڈزائین پسند آگئی تو ہزاروں ہزار مل جائیں گے۔ زندگی چین سے گذرے گی۔" تو وہ ایک فن کار کی استغنا سے کہتے۔ اُنہہ! خدا مجھے روکھی سوکھی یوں بھی دیتا ہے، ملک والے چاہیں گے

تو اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ نہیں تو سب کچھ میرے ساتھ قبر میں جائے گا۔"

دودو کو دو تین چیزوں سے بڑی محبت تھی۔ ایک تو پنسل سے۔ وہ بغیر اس کے زندہ ہی نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ اس کے موجد کو دعائیں دیتے تھے۔ کیا چیز بنا دی ہے اس شخص نے لکھتے رہو۔ خط کھینچتے رہو۔ کبھی ہاتھ کالا نہیں ہوتا۔ پنسل سے تصویر بنائی، لکیر کھینچی، تصویر نہ جچی، لکیر کچھ کج ہو گئی، فوراً ربڑ سے مٹا ڈالا۔ دوسری بنائی یا کھینچ دی۔ قلم میں یہ بات نہیں۔ وہ بغیر دوات کی مدد کے نہیں چل سکتا۔ یا جبتک پنسل ٹوٹ نہ جائے گھس کر ختم نہ ہو جائے، ایک سپاہی کی طرح ہر وقت مستعد اور تیار! وہ کہتے، "اس کے موجد نے خدا کی نعمتوں میں ایک نعمت کا مستقل اضافہ کر دیا ہے۔ زندہ ہوتا اور مجھے مل جاتا تو میں اس کے ہاتھ چوم لیتا۔"

دوسری چیز افیم تھی۔ وہ اس کی صبح شام چسکی ضرور لگاتے۔ وہ اس کے حاصل کرنے کے لئے شہر جانے والوں کی خوشامد کرتے۔ خشخاش بونے والے کسانوں کے ہل، ہتھوڑے، کھرپیاں، اپنے ہاتھ سے مفت بنا دیتے اور وہ اس کی قیمت کے لئے، روپیہ کا کام آٹھ ہی آنے میں کر دیتے تھے۔ صبح شام کا وہ منظر بھی قابل دید ہوتا تھا۔ جب وہ اپنی محبوبہ چنیا بیگم کی ضیافت کی تیاری کرتے تھے۔ پہلے وہ حقہ بھرتے تھے۔ چلم پر کوئلے کی ٹکیاں تین طرف کھڑی کرتے پھر ایک چھوٹا سا ٹکڑا آگ کا اس پر بیچ میں رکھتے۔ یہ کام دیہات کے بھدے اور بڑے بڑے چمٹوں سے ناممکن سا تھا۔ اسی لئے انھوں نے بڑی سُبک اور خوبصورت چمٹیاں ایجاد کی تھیں۔ چمٹی کی نوک

سے بڑی صفائی سے آگ کی چنگاری ٹکیوں کے سرے پر رکھدی جاتی۔ پھر آہستہ آہستہ ایک چھوٹی سی پنکھیا سے ہوا دے کر لگائی جاتیں۔ جب آدھے سے قریب ٹکیاں لگ جاتیں تو وہ حقہ کی طرف سے مطمئن ہو جاتے۔ اب بکس کھولا جاتا۔ اس کے ایک کونے میں ٹین کی ڈبیا میں کپڑے اور کاغذ کی کئی تہوں میں لپٹی ہوئی افیم ہوتی۔ اس میں چنے کے برابر چنیا بیگم نکالی جاتی۔ اسے چٹکی بھر روئی میں لپٹا جاتا۔ اب یہ گولی چائے کی پیالی میں تھوڑا سا پانی لیکر بار بار بھگائی اور نچوڑی جاتی۔ تقریباً نصف گھنٹہ تک یہ عمل جاری رہتا۔ جب اس کا یقین ہو جاتا کہ اب اس میں سوائے سفل کے کچھ نہیں رہ گیا ہے تو جوگا الگ رکھا جاتا۔ وہ پانی جو زرد رنگ سے گہرا ہوتے ہوتے اب سیاہی مائل ہو چکا ہوتا ہر ذرا ذرا ہونٹوں سے ٹرکا جاتا۔ حقہ پر دم لگتا جاتا۔ پاس بیٹھنے والوں سے باتیں ہوتی جاتیں اور زہر آلود پانی چٹخارے لیکر حلق سے اتارا جاتا۔

دودا کی اس وقت کی باتیں یادگار ہوتیں۔ اس وقت ان کا ذہن آسمان زمین کے قلابے ملانے میں کوئی دقت نہ محسوس کرتا تھا۔ وہ اس وقت کبھی شاعری پر اتر آتے کبھی داستان گوئی پر۔ ان کو آتش و صبا و رند و وزیر کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ وہ ان کی پوری پوری غزلیں جھوم جھوم کے پڑھتے ہوتے کہ پینک آجاتی۔ حقہ کی نیچہ میں لگی ہوئی مہنال اگر لبوں میں ڈھیلی دبی ہوتی تو سر کے جھٹکے سے وہ منہ سے نکل جاتی اور سر گھٹنوں سے جا لگتا۔ اگر مہنال دانتوں میں دبی ہوتی تو حقہ یقینی الٹتا۔ اور گرد بیٹھے ہوئے شاگرد چلم کی چنگاریاں جلدی

جلدی بجھاتے اور اُلٹے ہوئے حقہ کو پھر سے تازہ کرتے اور بھرنے کی سعادت حاصل کرتے۔ ایسے مواقع پر دودا انیون کو بُرا بھلا کہتے اور بچوں کو دعائیں بھی دیتے۔

دودا کو اکثر داستانیں پوری پوری یاد تھیں۔ جب وہ امیر حمزہ کے کارنامے اور شاہزادگان ایرج و تورج کی معرکہ آرائیاں بیان کرتے تو اپنے نحیف جُثے کو بھول جاتے۔ ان کی آواز میں ایک للکار پیدا ہو جاتی۔ اور وہ کبھی کبھی آدھے قد سے کھڑے ہو جاتے۔ انھیں عمرو عیار اور ملکہ بہار سے بڑی محبت تھی۔ اور وہ جب بھی عمرو کی زنبیل کا ذکر کرتے تو ان کی آواز سے یہ حسرت ٹپکتی تھی کہ کاش انھیں بھی ایک مرتبہ اس کے اندر داخل ہو کر اس کی سیر کا موقع مل جاتا کہ وہ یہ تو دیکھ لیتے کہ وہاں کون کون سے عجائبات جمع ہیں اور ساحروں نے کیسے کیسے طلسمات بنا رکھے ہیں۔ وہ اس زنبیل کے خزائن کا ذکر جھوم جھوم کر کرتے اور اسی جھومنے میں پینک آجاتی اور پھر بیچارے حقے کی شامت آجاتی۔

جنسِ لطیف سے ان کا لگاؤ دو چیزوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ ایک تو اُپلے والی سے اور دوسرے ان کی مرہنی بکری سے۔ اُپلے والی، خاصی تندرست ہٹی کٹی تھی۔ گو اس کی عمر ڈھل چکی تھی مگر اس کے انداز بتاتے تھے کہ اس دیوانہ گلستاں پر اب بھی دھوپ باقی ہے۔ دوسرے گھروں میں جب وہ اپلے دینے جاتی تو کھڑی کھڑی سودا کر کے چلی جاتی مگر دودا کے کمرے کے دروازے کے پاس وہ ہمیشہ اطمینان سے آکر بیٹھ جاتی۔ دونوں میں اپلوں کے وزن و قدر قامت کے لحاظ سے ان کے بھاؤ پر دیر تک بحث ہوتی۔ دودا کہتے "تو اُپلوں

کے دام میں ہمیشہ اپنے دام بھی شریک کر دیتی ہے۔" وہ ذرا اٹھلا کر کہتی "تم تو میاں سدا کے مسکھری باج ہو۔" اور کبھی یہ جیتے کبھی وہ۔ مگر ان کی سروردت بھر کے اُپلے بغیر دیے ہوئے وہ نہ ٹلتی۔

لوگ کہتے تھے کہ دس برس پہلے جبکہ دونوں نسبتاً جوان تھے۔ دونوں میں کچھ اور معاملات بھی یوں ہی طے تھے۔ لیکن سوائے ایک دفعہ کے کوئی چشم دید واقعہ نہ سنا گیا تھا۔ اس دن بارہ ۱۲ بجے جب سب لڑکے تین بجے تک کے لئے کھانا کھانے کی غرض سے چھوڑ دیئے گئے تو عظیم اللہ کو گھبراہٹ میں یاد آیا کہ وہ تختی دودا کے کمرے ہی میں چھوڑ آیا ہے۔ اب اگر تختی وہیں رہی تو وہ دھلے گی کب اور دودھیا لگا کر سکھائی کب جائے گی۔ پھر سہ پہر کی مشق خوشخطی میں کام چور، نا ہنجار، نا شدنی کے سے خطابات ہی نہ عطا ہوں گے۔ بلکہ دو چار تھپیاں بھی ہاتھ بڑھا بڑھا کر لینا پڑیں گی اس لئے وہ دبے پاؤں کمرے تک پہونچا۔ ممکن ہے کہ دودا سو رہے ہوں تو بس کام بن جائے گا۔ تختی لیکر چلا آؤں گا۔ اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ وہاں اندر سے "ارے کمبخت کیا کرتی ہے۔ ازار بند تو چھوڑ! سارے پیسے کھولے لیتی ہے" کے ساتھ ایک زنانی ہنسی کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ ٹھٹھک کر پھاٹک سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ اور اس نے اُپلے والی کو مع جھولے کے دودا کے کمرے سے مسکراتے ہوئے جھٹ کر نکلتے ہوئے دیکھا اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بے تحاشہ بھاگا۔ یہی بات لڑکوں لڑکوں سے ہوتی ہوتی بڑوں تک پہونچی اور دودا پر ہمسنوں نے نہ جانے کتنے فقرے کسے۔ وہ

بیچارے لاکھ صفائی دیتے۔ ہزاروں قسمیں کھاتے کہ کوئی اصلیت نہیں، وہ دیوتی یقینی اس وقت اس دن سب اپنی بقایا وصول کرنے کمرے میں گھس آئی تھی اور اس نے کمر بند میں بندھے ہوئے پیسوں پر ہاتھ بھی ڈال دیا تھا، مگر سب گردن ہلا ہلا کر یہی کہتے ؂

کلہ گرسنہ در خانہ خالی بر خواں
عقل باور نہ کند کز رمضاں می ترسد

غرض ایک تو تھی ان کی محبوبہ، معشوقہ جو کچھ بھی کہئے یہ اُپلے والی۔ دوسری جیتی جاگتی ان کی بکری۔ وہ اس کی بڑی دیکھ بھال کرتے شاگردوں کا یہ فرض تھا کہ وہ چند گھنٹے کے لئے کھیتوں اور باغوں میں اسے گھما لائیں۔ اس کے لئے پیپل اور برگد کی پتیاں فراہم کریں۔ اور مٹر، جو، گیہوں کی بھوسی اور جو کچھ گھر سے چھپا چرا کر لاسکیں، اس کے لئے ضرور مہیا کریں۔ وہ ان کے پلنگ کے قریب ہی بندھی رہتی اور سال میں دو بچے ضرور دیتی۔ جمنا پاری ہونے کی وجہ سے قد آور بھی تھی اور دودھ بھی کافی تھا۔ دودھ ہی دونوں وقت کی چائے اور بڑی اسی کے بل بوتے پر تھی۔ لوگ کہتے، بکری کا دودھ آدھا مینگنی آدھا بال لیکن وہ اس کی تعریف میں پورے پورے قصیدے پڑھ ڈالتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی کاٹھ والی پرانی کنگھی سے اس کے بالوں میں کنگھا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی گھنٹوں بیٹھے اس کا سر سہلایا کرتے تھے۔ وہ کیسا ہی نقصان کر ڈالے کسی کے باغ میں پھپکے ہوئے پودے کھا ڈالے کسی کے بستر کی چادر کا رومال بنا ڈالے کسی کے

پائجامہ کی مہری کو چبا کر کرتی کی آستین میں تبدیل کر دے۔ مگر دودا اس پر بھی کسی کی کڑی نظر نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ فوراً بیتیرے بدل کر تعاقب کرنے والے کے سامنے آجاتے سینہ سپر ہو جاتے "اجی جانور ہی تو ہے، سبز سبز کونپلیں دیکھیں، جی پھسل گیا۔ ایک آدھ گال کھا لیا اب اس کو مارنے سے کیا فائدہ وہ اپنی فطرت تھوڑے بدل سکتی ہے۔ اس کو خالق نے بنایا ہی ایسا ہے۔ وہ ہمارے آپ کی طرح مختار تھوڑے ہے"

ایک دن دودا صبح سویرے ہی سے دوسرے گاؤں کسی ضرورت سے چلے گئے۔ بے خیالی میں انھوں نے بکری پلنگ کے پاس سے کھولی تو ضرور مگر اسے کمرے سے باہر نہ نکالا۔ جلدی سے بکس سے ڈبیہ نکالی۔ اس میں سے دال برابر افیم توڑ کر جیب میں رکھی۔ اور کمرہ بند کر کے چلے گئے۔ دوپہر کو جب وہ پلٹے تو انھوں نے کمرے کے باہر سے "میں میں" کی آواز سُنی۔ کمرہ کھول کر دیکھا تو بی بکری بستر پر بیٹھی ہیں۔ اسی پر مینگنی بھی ہے اور اسی پر پیشاب بھی۔ ان کا محبوب پنکھا ٹوٹا پھوٹا بیٹھ کے نیچے دبا ہے اور ڈرائینگ کی پوری کاپی نوش جاں فرما چکی ہیں۔ محض چند ٹکڑے جو جگالی کے سلسلے میں منہ سے گر پڑے ہیں، اس کی شہادت کے گواہ ہیں۔

دودا نے بکری کو مارنا شروع کیا۔ وہ میں میں کر کے بھاگی۔ یہ بھی دوڑے۔ اب وہ بھاگتی جاتی ہے۔ اور یہ اس کا پیچھا

کرتے جاتے ہیں۔ وہ پھاٹک سے نکل کر بھاگی۔ دودوا نے قریب پڑا ہوا ایک چیلا اٹھا لیا وہ دو چار گز آگے تھی۔ انھوں نے چیلا کھینچ کر مارا۔ اس کی ایک ٹانگ جھول گئی اور وہ گر کر تڑپنے لگی۔ کچھ بچے کچھ بوڑھے شور سن کر دوڑ پڑے۔ دودوا پھڑکتی ہوئی بکری پر گھٹنے رکھے سوار تھے۔ پٹے کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ منہ سے کف نکل رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے، "اور کھائے گی میری ڈیزائین کی کاپی! اور کھائے گی میری ڈیزائین کی کاپی!" اور ایک ننھے سے ہاتھ سے اس کی گردن دبائے ہوئے تھے۔ اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ہاتھ سے اسے طمانچہ مار رہے تھے۔

لوگوں نے انھیں کھینچ کر جب الگ کیا تو وہ اکڑوں زمین پر بیٹھ کر سسکنے لگے "ہائے میرا ٹنکا۔ ہائے میری ڈیزائین کی کاپی۔ ہائے میری زندگی کی محنت!"

بکری اسی دن سے نکال دی گئی۔ اُپلے والی روزانہ آنے لگی۔ اب وہ اپلے ہی نہیں، دودوا کے لیے آدھ سیر دودھ بھی لاتی۔ اور جب یہ پیسہ ادا کرنے میں دیر لگاتے تو وہ اکثر دوپہر میں ان کے کمرے میں گھس کر ان سے پیسے چھین لے جاتی۔ احباب فقرے کستے "اب تو تم نے بکری کی جگہ بھینس پالی ہے۔" دودوا کڑوی مسکراہٹ سے جواب دیتے۔ اکثر کہتے "اُنہہ! تم لوگ جو جی چاہے سمجھو، مگر یہ بھینس اس بکری سے لاکھ درجے اچھی اس لئے کہ میری ڈیزائین کی کاپی تو سلامت ہے!"

——— افسوس ہے کہ اس کاپی کی سلامتی ان کی زندگی ہی تک رہی۔ پھر نہ جانے وہ پنساری کی پڑیا بنی یا بھینس کی کروی! ناقدروں کے ملک میں اس سے زیادہ کی کیا امید؟۔

حاجی بابا

زندگی کی تین منزلیں ہیں۔ بچپنا، جوانی، بڑھاپا۔ لیکن ہر منزل میں وہ طوفان وہ تموج، وہ گرداب نہیں پڑتے جو رحیم نے اپنے ساٹھ برسوں میں جھیلے۔ بچپنے سے بڑھاپے تک فوری انقلاب اس کی زندگی کا عنصر خاص تھے۔ گویا اچانک حادثے اس کا گھر ڈھونڈھتے پھرتے تھے۔ اس کی زندگی کا خمیر تھے۔ گویا وہ کسی بڑی طاقت کا کھلونا تھا۔ کبھی اچھال کر ترقی کی رفعتوں پر پہنچا دیا جاتا، کبھی زمین پر پٹک کر وہ پاؤں سے کچل دیا جاتا۔ اچھا تھا کہ جہالت نے اسے حساس نہ ہونے دیا تھا ——— مگر میں جبر و اختیار، تقدیر و تدبیر کے فلسفہ سے بحث کر کے آپ کو بدمزہ کیوں کروں۔ آپ تو کہانی سننا چاہتے ہیں، وہ سنئے۔

رحیم، کریم چوکیدار کا لڑکا تھا۔ پانچ برس کے سن میں رحیم کوٹھی کی غلام گردش سے دبے پاؤں نکلتا، نکل کر راجہ صاحب اور ان کے افسروں کی نظر بچا کر خانہ باغ میں دوڑتا، تتلیاں پکڑتا دکھائی دیتا۔ سانولا سا، تین فٹ کا ایک لڑکا۔ میلی سی نیکر، پھٹی سی قمیص پہنے، ننگے سر، ننگے پاؤں۔ مگر پورے ڈیل میں ایک چیز قیامت کی تھی، وہ تھی بڑی کالی کالی آنکھیں۔ بالکل

ہرن کی طرح غلافی، فطری طور پر سرمہ لگی ہوئی۔ ان آنکھوں کا دیکھنے والا رحیم کی بہتی ناک بھول جاتا اور اس کے بدبودار کپڑے بھی!

اور اس کے کپڑوں سے بو کیوں نہ آتی، کریم کی کوٹھری مشکل سے سولہ فٹ لمبی اور دس فٹ چوڑی تھی اسی میں کریم رہتا، اس کی بیوی بلاقن رہتی، مقیم رہتا، فہیم رہتا، رسلیا رہتی، رحیم رہتا۔ اسی میں برتن باسن رہتے؛ اسی کے فرش پر پیال ڈال کر سارا کنبہ لوٹ لگاتا۔ اسی میں وہ کاٹھ کا صندوق رہتا جو چوکیدار کو سرکاری وردی رکھنے کو ملا تھا اور وہ ٹین کا پنجا ہوا بکس بھی جو بلاقن اپنے ساتھ میکے سے لائی تھی۔ اور جسے سوائے اس کے کریم تک نہ کھول سکتا تھا۔

کریم کو پانچ روپیہ ماہوار اسٹیٹ دیتی تھی۔ بلاقن کو چار روپیہ ماہوار جیب خاص سے ملتے تھے۔ چوکیدار کو ریاست سال میں دو جوڑے دیتی تھی، کرتا، دھوتی لمبا کوٹ، پگڑی، یہ اس کا یونیفارم تھا۔ جب سے رحیم پیدا ہوا تھا ٹھاکر راجہ نے ایک گائے بھی عطا کر دی تھی اور سال میں دس پندرہ من موٹا اناج بھی مقرر کر دیا تھا۔ جب کبھی تیسرے چوتھے مہینے وہ لچھمن پور کی کوٹھی میں آتے تو وہ رحیم کو اپنے پاس بلا کر اسے دو چار روپئے الگ سے دیتے اور جانے سے پہلے بلاقن اور اس کے پورے قبیلے کو نئی پرانی دھوتیاں، ساریاں، قمیص ضرور بانٹ جاتے۔

اور سب تو خوش ہوتے مگر کریم جب بھی ان چیزوں کو دیکھتا تو اس کا چہرہ لال انگارہ ہو جاتا۔ وہ ٹھاکر صاحب کے قیام کے دوران میں تو کچھ نہ کہتا لیکن ان کے جانے کے دو تین دن بعد تک اس پر بھوت سوار رہتا۔ وہ بہانہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر

رحیم کو مارتا اور اگر بلاقن روکتی تو وہ اسے موٹی موٹی گالیاں دیتا۔ اور کبھی کبھی دو چار ہاتھ بھی جھاڑ دیتا۔

رحیم کو اپنے بچپن کے دو واقعات خاص طور سے یاد تھے۔ ایک تو باپ کی جلاوطنی، دوسرے ماں کا کوٹھی سے نکالا جانا۔

جاڑوں کا زمانہ تھا۔ دن بھر سورج کے درشن نہیں ہوتے تھے۔ شام کے قریب کچھ بوندیں بھی پڑی تھیں، ہوا برف میں جھلی ہوئی چل رہی تھی۔ بلاقن نے چراغ جلتے ہی سب کو کھلا پلا کر پیال پر لٹا کر بھٹا لحاف اوپر سے ڈال دیا تھا۔ اور کریم نو ہی بجے سے اپنی لالٹین اور موٹا ڈنڈا لیکر "جاگتے رہو" کی صدا لگاتا، کھانستا، کھنکھارتا کوٹھی کا پہرا دینے نکل گیا تھا۔ چار بجے کے قریب پلٹا تو بلاقن کوٹھری میں نہ تھی۔ وہ کوئی دس منٹ بعد کوٹھری میں آئی۔ کریم نے غرا کر پوچھا۔

"کہاں گئی تھی رے؟"

بلاقن نے کہا۔ "کہیں نہیں، باہر حاجت کو۔"

کریم نے کہا۔ "اچھا، جلدی سے چار بنا دے۔"

بلاقن نے کہا۔ "پیال پر بچے سو رہے ہیں۔ اور وہ سارے میں پھیلا پڑا ہے۔ چولھا کیسے جلاؤں، کہیں آگ نہ لگ جائے۔"

کریم بگڑ پڑا۔ "مر جانے دو سالوں کو۔ مجھے چار چاہئیے۔"

بلاقن نے تیرہ برس کے یتیم کو اٹھایا، فہیم، رسلیا اور رحیم کو کھسکا کھسکا کر جگہ بنائی اور چولھے میں آگ سلگائی۔ بچے سب جاگ پڑے۔ اور سب نے ماں کو گھیر لیا۔ ہم بھی چا پئیں گے کا شور مچانے لگے۔ کریم سو سو کر کے ایک کٹورے میں ساری چا

لئے پی رہا تھا۔ نجانے کیوں اسے غصہ آگیا اور اس نے کٹورا ہاتھ سے پھینک جلتی لکڑی کھینچ لی اور ہر ایک کو ٹھونکنا شروع کر دیا۔ مقیم، فہیم ہلکے ہلکے ہاتھ کھا کر بھاگ نکلے۔ رسلیا لحاف میں چھپ کر گٹھری بن گئی۔ رحیم نے ماں کی گود میں پناہ لی۔ کریم ان دونوں پر پل پڑا۔ اس کے منہ سے کف جاری تھا، اس کی آنکھیں خونِ کبوتر ہو رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ دھنئے کی صفائی اور پھرتی سے چلتا رہا۔ اس کی زبان سے دف دف، دھائیں دھائیں، دف دف، دھائیں دھائیں کی جگہ ہر مجادا، چھنال، ہر مجادا، چھنال کے لفظ نکلتے رہے۔ رحیم چیختا رہا۔ بلاقن خاموش مار کھاتی رہی۔ یہاں تک کہ دونوں کے سر پھٹ گئے۔ جسم کے کئی حصوں سے خون جاری ہو گیا۔ اور غلام گردش کے دوسرے نوکروں نے کریم کو کھینچ کر کوٹھری سے باہر نکال دیا۔

شور اتنا ہوا کہ راجہ صاحب آنکھ ملتے کوٹھی سے نکل پڑے۔ جب انھیں روداد معلوم ہوئی تو انھوں نے کریم کو سپاہیوں سے پکڑوا کر کھمبے سے بندھوا دیا اور دیوان جی اور ڈاکٹر کو بلوا بھیجا۔ ڈاکٹر نے بلاقن اور رحیم کی مرہم پٹی کی۔ دیوان جی نے کریم کو نہ جانے کیا ڈرایا دھمکایا، کیا لیا دیا کہ وہ اسی دن دوپہر کی گاڑی سے مقیم و فہیم کو لیکر کلکتہ چلا گیا اور ان میں سے پھر کوئی نہیں پلٹا۔

کریم کی اس جلاوطنی نے بلاقن پر جادو جیسا تیز اثر کیا۔ وہ دو چار ہی دن میں چاق و چوبند ہو گئی۔ وہ اب ہر وقت صاف ستھری رہنے لگی۔ وہ گنگنانے بھی لگی اور ہنسنے بھی۔ وہ اب پان بھی کھاتی۔ دھڑی بھی جماتی، اس کو بال سنوارنے کا بھی شوق ہو گیا، اور سرمہ لگانے کا بھی۔ رحیم سے بھی اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ محبت کرنے لگی تھی۔ اسے میلی قمیص پہننے نہ دیتی۔ اس کے نیکر میں بٹن برابر

ٹانک دیتی اور اس نے اس کے لئے ایک سوا روپیہ کا زری کا جوتا بھی خرید دیا۔

ٹھاکر صاحب بھی اسپر خاص عنایت کرنے لگے تھے۔ انھوں نے حکم دیدیا تھا کہ وہ جبتک کوٹھی میں رہیں، وہی صبح کو پوچپی کر کے اُٹھائے۔ وہ جب ان کی موٹی موٹی پنڈلیوں پر اپنی چھوٹی چھوٹی بند مٹھیاں مارتا تو وہ کروٹ لیکر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے اور اسے دیکھ کر مسکراتے۔ اس کے گال میں چٹکی لیتے۔ اس کے سر پہ ایک ہلکی سی ٹیپ لگاتے اور سرہانے کے قریب لگی ہوئی چھوٹی میز پہ پڑے ہوئے خوردہ میں سے روپیہ، اٹھنی، چونی، جو کچھ ہاتھ میں آجاتا، دیدیتے۔

اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے کوٹھی کا سارا عملہ اس کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اس سے دبتا ہے۔ اس سے ڈرتا ہے نوکر سمجھتے ٹھاکر کا منہ لگا ہے۔ راجہ کا چہیتا ہے۔ نہ جانے کس کے خلاف مالک کے کان بھر دے۔ کیا لگا، بجھا دے۔ اسی لئے بڑے بوڑھے اسے رسیم بھیا، رحیم میاں کہنے لگے اور نوجوان ملازم "چھوٹے ٹھاکر صاحب" پکارنے لگے۔

ماں کا پیار، راجہ کی نوازشیں، مہروں میں مان متاؤ۔ اس نے بھی ہاتھ پاؤں نکالے۔ اس کا ہیاؤ بڑھنے لگا۔ وہ اپنے کو کوٹھی کی اہم شخصیتوں میں سمجھنے لگا۔ وہ اب نہ کسی سے دبتا نہ ڈرتا تھا، بلکہ ہر ایک پر رعب جمانے لگا تھا۔ بس اگر کوئی اس کا مدمقابل تھا تو وہ لکھن۔ مدھری مہری کا لڑکا۔ لکھن اس کا ہم سن تھا، بس یہی مہینہ پندرہ دن اس سے چھوٹا۔ مدھری رانی کے ساتھ باندی بنکر آئی تھی۔ نوکر چاکر کہتے، لکھن راجہ ہی کا بیج ہے۔ صورت شکل میں وہ بہت ان سے ملتا جلتا تھا۔ اور مدھری کی کسی سے شادی نہیں ہوئی تھی۔ راجہ بھی اسے مانتے

تھے اور رانی بھی۔ لوگ کہتے تھے، مدھری رانی کی باندی ہی نہیں، سہیلی ہے۔ رانی بے اولاد تھیں اس لیے لکھن کو لڑکے کی طرح مانتیں۔ اس کے لیے نئے نئے کپڑے بنواتیں۔ اسکول میں تعلیم کا خرچہ دیتیں۔ اور جب بھی وہ لچھمن پور آتیں تو لکھن ان کے تمام کاموں کا مدارالمہام بن بیٹھتا۔

ایک دن اسی رام لکھن سے اور رحیم سے اٹھا ٹیک ہو گئی۔ بات کچھ نہ تھی۔ کوٹھی کے پاس والے میدان میں کنکوا اڑ رہا تھا اور اکثر ڈور اور کنکوا کٹ کر لان پر گرتے۔ رحیم اور لکھن دونوں پتنگ لوٹنے میں مگن تھے۔ اتنے میں ایک کنکیا بہت دور سے آکر گری، دونوں جھپٹے، چھین جھپٹ میں کنکیا ہی نہ پھٹی بلکہ ایک دوسرے کے گریبان بھی۔ رحیم کو کریم کے ڈنڈوں نے خاصا مضبوط بنا دیا تھا۔ اس نے لکھن کو دھرے مارا۔ اس نے اپنے کو بے بس پاکر دانتوں سے مدد لی اور بوری بوٹی اتار لی —— وہ دونوں ابھی گتھے ہوئے تھے کہ دونوں کی مائیں آپہنچیں۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے مر بچول پر غرہ تھا، پھر سینے میں مدتوں سے کھولتا ہوا ڈاہ بھی تھا۔ پہلے تو اپنے اپنے لڑکوں کی طرفداری میں گرم گرم باتیں رہیں۔ پھر دلوں میں بھرا ہوا ارس کھلا، نوبت ہاتھا پائی تک پہونچی۔ ایک دوسرے کے جھونٹے گھسیٹے اور نوچے گئے۔ ناخنوں اور دانتوں نے بھی اپنی تیزی دکھائی اور دونوں چہرے خاک و خون میں گھسے اور بگڑے گئے۔ لکھن کی داد یلا سنکر دوسرے ملازم بیچ بچاؤ کے لئے پہونچے۔ ایک محل میں سنبھال کر پہونچائی گئی اور دوسری چوکیدار کی کوٹھری میں۔

مگر رانی نے اپنی داسن کی حمایت میں ساری کوٹھی سر پہ اٹھا لی۔ بلاقن کو کوٹھری خالی کرنا پڑی اور اس نے رحیم اور سلیا کے ساتھ قصبے کی ایک ٹوٹی کوٹھری میں بسیرا لیا۔

بلاقن کا اندوختہ چند ہی دن کفایت کر سکا۔ پھر اس نے ایک خانصاحب کے ہاں کھانا پکانے کی نوکری کر لی۔ رحیم کبھی مزدوری کرتا، کبھی پاس کے جنگل سے سوکھی لکڑیاں اکٹھا کر کے لاتا اور چھ آنہ اور آٹھ آنے میں بیچتا۔ رسولیا گھر پر رہتی۔ اس تنہائی نے اسے پر پرزے نکالنے کا موقع دیا۔ ابھی اس نے بارھویں میں قدم رکھا ہی تھا کہ محلے کے نوجوان اس کی کوٹھری کا چکر کاٹنے لگے۔ تیرھویں برس وہ ایک مشہور بدمعاش کے ساتھ جس کی پولیس نگرانی کر رہی تھی، قصبہ سے بھاگ گئی۔

رحیم اور بلاقن کے دو چار دن اس کی تلاش میں ضایع ہوئے، پھر زندگی اپنے دھارے پر آ لگی۔ بیٹا باقاعدہ لکڑہارا بن گیا اور ماں باضابطہ کھانا پکانے والی۔ شام کو وہ خانصاحب کے ہاں سے جب آتی تو اتنا باندھ لاتی کہ خود بھی کھاتی اور رحیم کو بھی کھلاتی۔ صبحکو وہ اس کے لئے دو موٹی موٹی روٹیاں ٹھونک دیتی اور کبھی ساگ، کبھی آلو، کبھی کوئی ترکاری جلدی جلدی پکا دیتی۔ وہ اسے لیکر اپنا کلہاڑا لئے جنگل جاتا اور وہیں دن بھر لکڑیاں کاٹنے میں صرف کر دیتا۔ لیکن یہ خاص بات تھی کہ جو کچھ وہ کماتا سارا کا سارا ماں کو لا کر دے دیتا اور اسے وہ ہر روز اس سے بھی چھپا کر ایک کونے میں زمین میں گاڑ دیتی۔

ایک دن شام کو وہ بازار میں اپنا گٹھا لئے بیٹھا تھا کہ ٹھاکر صاحب کا موٹر ادھر سے گذرا اور ٹھاکر صاحب نے اسے دیکھ لیا۔ رحیم نے جب انھیں سلام کیا تو انھوں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ پھر ڈرائیور کی طرف اس طرح جھکے، جیسے اسے روکنے کا حکم دینے والے ہیں۔ پھر فوراً ہی اسے تیز نکال لے چلنے کا حکم دیدیا۔ اور موٹر قصباتی کچی سڑک کی گرد و غبار میں چھپ گیا۔ رحیم کا دل نجانے کیوں

دیر تک بلیوں اچھلتا رہا۔ پھر وہ لکڑی کے خریداروں کی مول تول میں سب کچھ بھول گیا۔

شام کو ایک ہرکارہ آیا، سرکار بلاتے ہیں۔ رحیم نے صاف ستھری قمیص پہنی مگر نہ دھلی دھوتی تھی اور نہ جوتا۔ مجبوراً اسی طرح ننگے سر ننگے پاؤں ٹھاکر صاحب کے سامنے گیا۔ وہ کمرے میں تنہا بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ جب اس نے سلام کیا تو قریب بلایا اور عجیب طرح منہ بنا کر کہا۔ "کیوں میاں کلو، تم نے ہمیں چھوڑ دیا؟"

رحیم کیا کہتا۔ اس نے جھک کر ان کے پاؤں پکڑ لئے۔ انھوں نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "میں جانتا ہوں کہ رانی نے تم لوگوں کو نکال دیا مگر — خیر — بلا قصن کیا کرتی ہے؟"

رحیم نے جب بتایا کہ وہ خانصاحب کے ہاں کھانا پکاتی ہے تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انھوں نے بڑے زور سے ہوں کی۔ پھر وہ بولے "دیکھو جی۔ آج ہی جا کر اپنی ماں سے کہہ دینا کہ وہ نوکری چھوڑ دے۔ اس کو بیس روپئے ماہوار اس سرکار سے برابر ملا کریں گے۔ میں دیوان جی سے تاکید کر دوں گا۔" رحیم خاموش رہا تو وہ تیوری چڑھا کر بولے۔ "سنا تم نے؟" اس نے ڈر کر جلدی سے کہا "جی سرکار!" انھوں نے دس دس کے دو نوٹ بڑھائے۔ "لو یہ اسے دے دینا اور دیکھو کل سے کسی کی نوکری وکری پر نہ جائے"

رحیم نے جب روپئے لئے تو وہ ذرا مسکرائے۔ "اور تم کیا جانتے ہو؟"

اس نے کہا، "روجانہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاتا ہوں اور روپئے دھیلی کی بیچ لیتا ہوں۔"

انھوں نے کہا "ہے تو مرد بچہ کا کام، پر اپنے سن کے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے لکھنے کا جی نہیں چاہتا؟"

رحیم نے کہا۔ "جی چاہتا کیوں نہیں، پر خرچا کہاں سے آئے گا؟"

راجہ بولے۔ "خرچہ میں دوں گا!....." پھر سوچ کر بولے۔ "مگر تم نے تو الف، بے بھی نہیں پڑھی ہے۔ اچھا اب کے جو لکھنؤ چلوں گا تو تم کو ساتھ لیجا کر کسی اچھے اسکول میں داخل کرا دوں گا۔ تیار رہنا۔"

رحیم نے کہا۔ "بہت اچھا"۔۔۔ اور اس کے اس حکم پر کہ اچھا جاؤ، پھر رہ تو آنا، وہ کمرے سے دھڑکتے دل سے نکلا اور گھر تک یہی سوچتا چلا آیا۔ کہ یہ پڑھنے لکھنے کا جھگڑا میرے پیچھے پڑا۔ ساتھ والے لڑکے سب ہنسیں گے اتنا بڑا ہو گیا الف کے نام لٹھا بھی نہیں جانتا۔ کہاں کا جنگلی ہے۔ سب طرح طرح سے بنائیں گے۔ مذاق اڑائیں گے۔ مسخری کریں گے"۔

ماں کو راجہ صاحب کا حکم سنایا اور روپئے دیئے تو وہ خوشی سے رو دی۔ بار بار کہتی "بڑے اچھے ہیں ٹھاکر صاحب"۔ اور سناٹے میں آجاتی۔ جیسے وہ بڑے خوبصورت سے خوبصورت خواب دیکھ رہی ہے۔ اور جب رحیم کھا پی کر سو گیا تو اس نے کپڑے بدلے آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ اور ہونٹوں پہ مسی کی دھڑی جما کر بنگلے کی طرف خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے چل دی۔

راجہ کے ہاں رحیم کو ہر روز جانا پڑتا۔ وہی پچھلی آؤ بھگت ہونے لگی۔ رانی صاحبہ اب کی لکھنؤ میں تھیں۔ اس لئے نہ تو رام کھن تھا اور نہ اس کی منہ لگی ماں۔۔۔ بلاقن بھی شب کو غائب رہنے لگی۔ جب دس بجے رحیم کھانے لیتا جاتا تو وہ کوٹھری

کے کواڑ آہستہ سے کبھی کر نکل جاتی اور کبھی بارہ بجے، کبھی دو بجے، کبھی پو پھٹنے واپس آتی۔ نہ رحیم کو ماں کے آنے کی خبر تھی۔ اور نہ اسے اس کی فکر۔ وہ تو اپنی ہی ادھیڑ بن میں الجھا ہوا تھا۔ لکھنؤ جانے کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا چار قمیص، چار پائجامے، دو کوٹ، دو جوڑے جوتے اب تک سل چکے تھے۔ اور کپڑے سل رہے تھے۔ انگریزی کی پرائمر اور اُردو کی الف، بے، پڑھائی جا رہی تھی، تختی کبھی مشق کرائی جا رہی تھی۔ کاپی کبھی لکھوائی جا رہی تھی۔ اور کلہاڑا چلانے والے ہاتھوں کو قلم پکڑنے کی عادت دلائی جا رہی تھی۔

لکھنؤ جانے میں ایک دن رہ گیا تھا کہ دفعتاً راجہ کو درد قولنج ہوا، ڈاکٹر آیا، حکیم آئے، وید آئے، رانی صاحبہ آئیں اور لکھنؤ سے الوپیتھک اور ہومیوپیتھک کے ماہرین لائیں۔ کسی طرح افاقہ نہ ہوا۔ پھر انھیں ایمبولینس کار میں لاد کر لکھنؤ میڈیکل کالج لائے، وہاں اکسرے ہوا اور آپریشن —— مگر موت آچکی تھی۔ جب ہر طرح کامیابی دکھائی دینے لگی، دل کی حرکت بند ہو گئی۔

راجہ کا مرنا تھا کہ جیسے بلاقن کے لئے کوئی زندگی کا سہارا نہ رہا۔ نہ جانے کیوں وہ آپ ہی آپ سست رہنے لگی۔ اور چند ہی مہینے میں کھانسی بخار کے بہانے وہ بھی چل بسی —— پندرہ برس کا رحیم اب بالکل بے سہارے تھا۔ نہ راجہ، نہ بلاقن۔ اس نے پھر کلہاڑی اٹھائی، دن بھر لکڑیاں کاٹتا، شام کو انھیں بیچتا اور اپنے ہاتھ سے کچا پکا کھا کر پڑ رہتا۔ زندگی میں خوشی تھی، نہ کھیل بہل، نہ ساتھی، نہ غمخوار وہ تھا اور اس کی یادیں، مگر ان حادثات نے اسے بچے کی جگہ جوان بنا دیا ——

اس کا یقین اسے اس دن ہوا، جب راجہ کے انتقال کے چھ مہینے بعد

رانی نے رام لکھن کو گود لیا۔ اور بنگلہ پر حاضری کا پورے قصبہ کو ڈگڈگی کے ذریعہ حکم ملا۔ رحیم شاید اس پر بھی اپنی کوٹھری میں بند پڑا رہتا، لیکن رام لکھن نے سپاہی بھیجکر اسے سہ پہر کو بلوا بھیجا۔ رحیم جانتا تھا اسے اس قصبہ میں رہنا ہے اور رام لکھن اس کا راجہ ــــ تالاب میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر اس لئے ڈرتا جھجکتا راجہ کے دیئے ہوئے کپڑے پہنکر حاضر ہوا۔

رام لکھن جس کا نام آج سے رام لچھمن سنگھ ہو گیا تھا، مرغ زرّیں بنا بنگلے کی روشوں پر ٹہل رہا تھا۔ جب رحیم نے اسے ڈرتے ڈرتے سلام کیا تو وہ مسکرا کر بولا، "کہو رحیم اچھے رہے؟"

رحیم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جی ہاں سرکار!" اور اس نے غریب پرجا کی طرح دانت نکال دیئے۔

نیا راجہ بڑے زور سے ہنسا۔ اس نے رحیم کو ساتھ لیا۔ وہ بنگلے کے اس کمرے میں گھس گیا جہاں لچھمن پور کے راجاؤں کی بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اور مرمہ ٹھاکر صاحب کی تصویر کے سامنے شمع لے جاکر بولا۔ "دیکھتے ہو انھیں یہ بڑے ہی ہتھیارے تھے!" رحیم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رام لکھن کا منہ نوچ لے۔ مگر رام لکھن نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے رحیم کو کھینچکر ایک آئینے کے سامنے کر دیا اور کلغی دار پگڑی اس کے سر پر رکھ کر کہا۔ "لے دیکھ اپنے کو،..... اور اس ہتھیارے کو بتا کوئی فرق ہے؟"

رحیم نے عمر میں پہلی مرتبہ اپنے کو آئینے میں دیکھا۔ دھوپ کی تمازت اور دھول مٹی میں اَٹے رہنے نے اس کے سانولے رنگ کو سیاہی مائل کر دیا تھا،

راجہ کا رنگ گیہواں تھا اور رام لکھن کا خاصا صاف، مگر ناک نقشہ تینوں کا ایک تھا۔ وہی چوڑی پیشانی، وہی غلافی آنکھیں، وہی گلے کی ابھری ہڈیاں، وہی چوڑی ناک، وہی موٹے ہونٹھ اور وہی مخروطی ٹھوڑی۔

رحیم پورے جسم سے ہلنے لگا، جیسے کوئی اندر ہی اندر سے اس کی رگوں کو کھینچتا، تانتا اور جھنجھوڑتا ہے۔ پھر دفعتہً اس کی رگوں میں گرم گرم لہو تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس کے نتھنوں سے دھواں سا نکلنے لگا۔ اسے راجہ پر، نال پر، اپنے پر غصہ آنے لگا۔

رام لکھن سنگھ نے کہا: "دیکھا تم نے، میں نے کیوں ہتھیار اٹھایا۔ میں کہاری کے پیٹ سے، تم چوکیدارن کے پیٹ سے مگر باپ ہم دونوں کے ایک۔ یہی راجہ دلیپ بہادر سنگھ۔ تم آج کیا ہو؟ لکڑہارے! لڑائی نہ ہوتی تو میں کیا ہوتا؟ کہار! مزدور! پاپ کرنے کو کتنی ہمت چاہیئے۔ پر دیکھو، وہ ہمیں تمھیں دونوں کو کچھ لکھ جاتے تو تم آج اس طرح پیٹ پالنے کے لئے لکڑیاں کیوں کاٹتے، کنڈے کیوں پاتھتے؟ کیا اب بھی تم انھیں ہتھیارا نہیں سمجھتے؟"

رحیم کے دل میں دفعتہً ایک آگ سی لگ گئی۔ شاید ٹھاکر صاحب زندہ ہوتے تو وہ اسی وقت ان کے سینے پر سوار ہو کر اپنے ہاتھ سے ان کا گلا گھونٹ دیتا۔ اماں اگر اس وقت منوں مٹی میں منہ چھپائے نہ پڑی ہوتی تو وہ اس کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دیتا۔ کریم ٹھیک کہتا تھا: "چھنال" —— جب اس نے ٹھاکر سے حرام کرایا تھا تو وہ لڑ کر رانی کیوں نہ بنی۔ اس نے چند پیسوں پر اپنے کو کیوں بیچا۔ اس نے پکار پکار کر کیوں نہیں کہا کہ میں اس راج کے ناگ

کی بیوی ہوں میں اس ریاست کے راجہ کے پہلو میں لیٹتی ہوں۔ رحیم کے لئے کیوں نہیں لڑی بھری نے تو رام لکھن کو راجہ منوا لیا، مگر اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ ٹھاکر سے کہہ کر دو ایک گاؤں ہی لے لیتی۔

اس نے اپنے سر سے پگڑی اتار کر پھینکی اور وہ جھپٹتا ہوا کمرے سے چلا۔ اسے نہ تو نئے راجہ کی آواز سنائی دی اور نہ دروازے پر کھڑے دیوان جی دکھائی دیئے۔ وہ اس وقت بہرا اور اندھا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے مختلف طرح کے رنگ چھوٹتے تھے۔ سبز، کاہی، نیلا، پیلا، مگر ان سب پر سرخ رنگ غالب تھا، لہو کا رنگ۔ اور کان برابر بجتے جا رہے تھے اور ایک ہی آواز تھی جو گونج رہی تھی "ہتھیارا! ہتھیارا!"

وہ لپکا ہوا اسی طرح مجمع کو چیرتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ پھاٹک کے پاس ایک کہارن نے ہاتھ پکڑ لیا۔ رحیم نے اسے جھٹک کر الگ کرنا چاہا تو وہ بولی: "کیا ہوا ہے تم کو بھی رحیم۔ سنتے نہیں، تم کو ٹھکرائین بلاتی ہیں!"

ایسا معلوم ہوا جیسے رحیم کو سوئی چبھو کر کسی نے چونکا دیا۔ رام لکھن سے لڑائی کے دن ماں کے ساتھ اسے بھی ٹھکرائین کے سامنے جانا پڑا تھا۔ کیسی کیسی گالیاں دی تھیں انھوں نے ماں کو۔ ان کا زرد رنگ کیا لال انگارا ہو گیا تھا اور ان کی دھنسی دھنسی آنکھوں نے کیسی کیسی چنگاریاں برسائیں تھیں اس دن ـــــ ڈر بیٹھا ہوا تھا اس کے دل میں رانی کا، جو اس دن کے بار بار حرامی پوت کہنے پر بھی اس کی زبان نہ کھل سکی تھی۔ لیکن اسی دل میں حد درجہ نفرت کا بیج بھی اس گالی کی تکرار نے بو دیا تھا۔ آج جب ان کے جلاپے کی وجہ معلوم ہو گئی تو رحیم کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس بیج میں کونپلیں ہی نہ نکلیں بلکہ وہ ایک ہرا بھرا درخت ہو گیا۔ آخر وہ بھی تو اسی مثلث

کا ایک کونہ تھیں جنہیں ٹھاکر صاحب نے بجلیاں گرائی تھیں — اس کی ماں کی موت — وہ رانی تھیں، مہری اور راجہ رام لچھمن سنگھ بہادر کی ماں اور اس کی ماں بلاقن چوکیدارن لکڑ ہارے کی ماں! — اب نہ راجہ تھے، نہ بلاقن، نہ مہری مگر یہ تو تھیں، بس کی گانٹھ انھوں نے بلاقن کو نکالا، انھیں نے رحیم کو راجہ سے چھڑایا، انھیں نے مہری کو سر چڑھایا، انھیں نے رحیم کا بھی حق چھین کر رام لچھمن کو دیدیا اور مہری کے بچے کو راجہ بنا دیا — بس اس سے زیادہ سارے بدلوں کا مستحق کون ہو سکتا ہے —

چلو چلیں، دیکھیں کیوں بلایا ہے اس ڈائن نے۔

محل میں بڑی چہل پہل تھی۔ مہریاں باندیاں سب نئے نئے جوڑے پہنے جوڑوں میں پھول لگائے، گلوں میں بدھیاں ڈالے ہر طرف گاتی، گنگناتی، ہنستی، ٹھٹھولیاں کرتی، دوڑتی پھر رہی تھیں۔ کوئی مٹی کے دیئے جلا جلا کر برآمدے کی دہلیز پر سلیقے سے لگا رہی تھی، کوئی پان بنا بنا کر بیڑوں پر چاندی کے ورق لگا رہی تھی۔ لان کے بیچ و بیچ میں ایک زرنگار کرسی بچھی تھی۔ اس کے اوپر ایک زربفت کا شامیانہ ٹنگا تھا۔ اس شامیانے کی گنگا جمنی چھڑوں پر گلابوں کی بیل دوڑائی جا رہی تھی اور شامیانے کے ایک سرے سے دوسرے تک جوہی کے ہاروں کی جھالریں لٹکائی جا رہی تھیں۔ برآمدے سے لیکر شامیانے تک سرخ ڈوریاں باندھی تھیں۔ جس میں برابر سے چینی قندیلیں لٹکائی تھیں۔ قندیلوں کے درمیان بھی پھولوں کے گچھے اور نقیش کے گچھے لٹکائے تھے۔ گھر کا کونا کونا چمک رہا تھا۔ ایک چمن کی طرح مہک رہا تھا۔

رحیم کا غصہ رفع ہو گیا۔ اور ایک کیف سا طاری ہونے لگا۔ اس کے دل میں تاک کے جھانکنے، چہل پہل دیکھنے کا شوق گدگدی کرنے لگا۔ وہ اپنے جذبات کے

تلاطمی انقلابات سے گھبرایا گھبرایا، کچھ جھینپتا، کچھ سہما، گردن جھکائے مہری کے پیچھے پیچھے اس کمرے کے دروازے پر پہونچا، جس میں رانی صاحبہ سنگار میں مصروف تھیں، مہری نے دروازے پر روک کر کہا۔

"ٹھہرو میں اطلاع کر دوں"

رحیم ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ مہری نے ایک پٹ آدھا کھولا۔ اور اندر داخل ہو کر کہا۔ "سرکار" رحیم آئے ہیں۔"

رانی نے کہا۔ "تم جاؤ، اسے اندر بھیج دو۔"

رحیم کے دل میں دروازے پر روکے جانے نے پھر زہر بھر دیا۔ یہ میرے ہی باپ کی باجھ جورو ہے نا! اسی راجہ کی بیوی جس کو میری ماں نے میرے جیسا بیٹا دیا۔ اسی لکڑہارے کے باپ کی رانی۔ کیوں نہ اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹ دوں؟ یہ ناگن، یہ مرکھنی بھلا!.....

مہری نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ سامنے سفید ساری میں لپٹی رانی کھڑی تھیں ان کا چہرہ بھی اتنا ہی سوکھا اور سپید تھا جتنی کہ ساری۔ کندھے کے پاس ساڑھی نیچے کی طرف کچھ ابھری ابھری تھی — رحیم کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ پر تول رہی ہیں۔ اسی آکاش میں اڑ جانے کے لئے جہاں کی وہ رہنے والی ہیں۔ وہ رانی نہیں، انسان نہیں، گوشت پوست کی بنی نہیں بلکہ وہ کوئی دیوی۔

وہ منہ کھولے بت بنا کھڑا رہا۔

مہری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "آگے بڑھو، سلام کرو۔" رحیم نے اندر قدم رکھا۔ مہری نے دروازہ بھیڑ دیا۔ رحیم نے ایک مشین کی طرح ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔

رانی آہستہ آہستہ آگے بڑھیں۔ انھوں نے اپنے برف جیسے ٹھنڈے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر رحیم کے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ اور اس کے پورے خدوخال پر نظر ڈالی۔

وہ ایک لمبی سانس لیکر بولیں "اُف تو تو بالکل راجہ پر پڑا ہے! — تیرے سن میں وہ بالکل ایسے ہی تھے!"......

رحیم نے بھی ایک لمبی سانس لی۔ رانی نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر بڑی بے بسی سے کہا۔ "بھگوان کی لیلا! ممکن تھا کہ تو میرے ہی پیٹ سے ہوتا!" — پھر وہ رحیم کے کندھے پر ایک ہاتھ رکھ کر بولیں "جانتا ہے: میں تیری کون ہوتی ہوں؟"

رحیم کے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر آواز نہ نکلی۔ انھوں نے کندھا ہلا کے جھنجھوڑ کر کہا "جانتا ہے؟" رحیم نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "ماتا!" غصہ کا طوفان، نفرت کا طوفان اٹھ چکا تھا۔ اب محبت کا طوفان اٹھا۔ پندرہ برس کا نوجوان، جاہل، غیر تربیت یافتہ، نہ اسے جذبات پر قابو پانا سکھایا گیا تھا نہ ان کو چھپانا: رانی کی نفیس ساڑھی میں لپٹی ہوئی موہنی شخصیت، ان کی لمبی لمبی ٹھنڈی سانس، ان کے محبت میں بھرے ہوئے الفاظ، ان کی ممتا سے بھرّائی آواز رحیم کے دل پر لگی۔ وہ دو تین بار سسکا۔ پھر وہ زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

رانی نے اس کا سر بے اختیار سینے سے لگا لیا وہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئی بولیں۔ "ہاں، میں تیری ماں ہوں تیری کوکھ اجڑی ماں!" انھوں نے خشک سسکیاں لیتے ہوئے رحیم کو سہارا دے کر پاس والی گدی دار کرسی پر بٹھا دیا — وہ اپنے سنگار میز کے پاس جاکر کھڑی ہوگئیں۔ وہاں کچھ نہ تھا سوائے ایک برش اور

اسی میں اٹکے ہوئے ایک کنگھے کے۔ اس نے کنگھا اٹھا کر دندانوں کی طرف سے کئی بار برش پر مارا۔ ایک ہلکی چُخ چُخ کی آواز پیدا ہوئی پھر وہ تن کر کھڑی ہوگئیں۔ اور انھوں نے تالی بجائی —— دروازہ کھلا اور ایک مہری داخل ہوئی۔

رانی نے کہا۔ "دیوان جی کو بلاؤ" —— مہری باہر گئی۔ وہ ٹہلنے لگیں۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ان کی پتلی پتلی انگلیاں کھلتی اور بند ہوتی تھیں وہ رک کر ٹھٹھک کر رحیم کو دیکھتی تھیں اور پھر ٹہلنے لگتی تھیں

بارے دیوان جی آئے۔ پانچ فٹ کا قد، سر پہ پگڑیا، ماتھے پر تلک، ناک پر عینک، دبلے پتلے ہی نہیں بلکہ سوکھے ہوئے اگر گ باراں دیدہ —— رحیم ان کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ رانی نے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ رانی نے دیوان جی سے کہا۔ "دیکھتے ہیں آپ اس لڑکے کو۔ یہ نہ سورگ باشی راجہ کا تیر۔"

دیوان جی نے کھانسی میں اپنی سکراہٹ چھپا کر کہا۔ "جی۔ میں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔"

وہ بولیں۔ "میں نے تو آج اس کو دیکھا۔ آپ نے کبھی مجھ کو نہ بتایا۔ اس سے پہلے جب یہ میرے سامنے لایا گیا تھا تو میں غصے سے اندھی ہو رہی تھی ہائے بڑا انیائے ہوا!....."

دیوان جی خاموش رہے۔ رانی جی ٹہلنے لگیں۔ عجیب بے بسی سے ہاتھ ملتی جاتی تھیں، کہتی جاتی تھیں۔ "کیا کیا جائے دیوان جی اس کے لئے؟ بتائیے کیوں نہیں دیوان جی؟ بڑی ہتیا ہوئی دیوان جی! بڑی ہتیا! یہی تو بڑا بھی ہے دیوان جی! —— اور..... یہ مجھ کو اتنا کھینچتا ہے دیوان جی، ہا ہا!"

دیوان جی نے سمجھ لیا اس وقت ٹھکرائین کے ہاں ماتا کا زور ہے، کئے کا بچھتاوا ہے، سخاوت کا دریا لہریں مار رہا ہے۔ وہ رام لکھن کو بھول گئی ہیں، ان کو گود لینا سہو ہو گیا ہے، انھیں نہ راج دیا کا دھیان ہے اور نہ اس کا ہوش کہ رحیم مسلمان اور لچھمن پور کی ریاست ہندو ہے۔ اس وقت جوش میں وہ نہ جانے کیا کہہ ڈالیں، کیا کر ڈالیں، اس لئے وہ کھانسے، انھوں نے رحیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس سے کہا۔ "رحیم بیٹے، تم اس سمے چلے جاؤ ذرا میں رانی صاحبہ سے باتیں کروں گا۔"

رحیم کمرے سے نکلا اور تیز قدم رکھتا ہوا سیدھا اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ محل کی چہل پہل، خوشبوؤں، گانوں اور باجوں کے بعد اپنی کوٹھری واقعی کالی کوٹھری محسوس ہوئی۔ پھر بھی وہ کچھ ایسا ذکی الحس نہ تھا کہ ساری رات اختر شماری میں کاٹ دیتا۔ اس نے اپنے کھاٹ پر لیٹ کر دو ایک کروٹیں لیں، پھر خراٹے لینے لگا۔

صبح کو جب وہ اپنی کلہاڑی کندھے پر رکھے جنگل جا رہا تھا تو اسے پیادہ ملا۔ "دیوانجی نے بلایا ہے"۔ مجبوراً حاضر ہونا پڑا۔ وہ کوٹھی کی غلام گردش کے پاس ہی ٹہلتے ہوئے ملے۔ اسے اپنے ساتھ دفتر میں لے گئے، اسے ایک کرسی پر بٹھا کر خود کمرے کی پیمائش کرتے رہے۔ غالباً جو بات کہنا چاہتے تھے۔ اس کے عنوان پر غور کر رہے تھے۔ پھر رحیم کے سامنے آ کر کھڑے ہو کر بولے "کیوں بھئی، تم نے رات کی باتوں کا کسی سے ذکر تو نہیں کیا؟"

رحیم ہنسا۔ "دیوانجی میرا باپ راجہ ہو یا کریم چرکیدار مجھے کیا میں تو لکڑہارا ہوں"۔ انھوں نے بڑھ کر پیٹھ ٹھونکی۔ شاباش، مردوں کے، یہی ڈھنگ ہیں۔ اصل

دولت وہی ہے جو آدمی اپنی قوت بازو سے کمائے۔ یہ کیا کہ کسی اور نے کمایا اور ہم نے اڑایا۔" رحیم کھڑا ہو گیا۔ "تو کچھ اور حکم ہے کہ میں جاؤں؟"

دیوانجی نے سٹ پٹا کر کہا۔ "نہیں جی، ذرا بیٹھو، اتنی جلدی کیا ہے....."

رحیم نے کہا "جتنی دیر میں جاؤں گا۔ اتنی ہی کم لکڑیاں کاٹ سکوں گا۔"

دیوانجی کو الجھی ہوئی ڈور کے سلجھانے کا سرا مل گیا۔ وہ کڑک کر بولے "تو یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ تم کو جنگل کی لکڑیوں کا ٹھیکہ ہی کیوں نہ دیدیا جائے۔ جتنی جی چاہے کاٹو۔ جتنی جی چاہے بیچو۔"

رحیم نے ذرا گھبرا کر کہا۔ "مگر دیوان جی میرے پاس اتنے دام....."

وہ بات کاٹ کر بولے۔ "اجی تم سے دام وام کچھ نہیں۔ یہ تمہاری رانی ماتا نے تم کو دیا ہے....."

رحیم نے پھر گھبرا کر کہا۔ "مگر دیوان جی اتنا بڑا جنگل۔۔۔"

دیوان جی ہنسے۔ "ہاں ہاں، تین میل کا جنگل ہے۔ تم کھڑا بھی بیچ ڈالو تو دس پندرہ ہزار میں سیکڑوں خریدار مل جائیں گے۔ مگر میری رائے یہ نہیں۔ تم کو چاہیئے کہ تم اسے خود کٹواؤ، جلانے والی لکڑی الگ، بیچو اور کام کی لکڑی الگ۔"

رحیم نے کہا۔ "مگر دیوان جی میرے پاس اتنے روپے....."

دیوانجی اس وقت اسے بات کرنے کا موقع نہ دینا چاہتے تھے۔ "ارے روپیوں کا بھی انتظام ہو گیا ہے۔ یہ دیکھو، راجہ نے پورے ایک ہزار دیئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بس تم اس کاغذ پر انگوٹھے کا نشان لگا دو۔"

رحیم نے پوچھا۔ "کاغذ میں کیا ہے دیوان جی؟"

دیوان جی نے ایک جھرجھری سی لی: "کچھ نہیں، یہی لکھا ہے کہ تم کبھی اس ریاست پر کوئی دعویٰ نہ کرو گے۔"

رحیم ہنسا: "میں اور دعویٰ! میں کس بوتے پر دعویٰ کروں گا۔ کوئی بیٹا اپنی ماں کو بھری کچہری میں اس طرح گالی دے گا!"

دیوان جی کے چہرے پر رنگ آگیا۔ یہ جاہل لٹھ رحیم پڑھے لکھے رام لچھمن سنگھ سے کہیں اچھا تھا۔ اس میں شرافت کی زیادہ بو باس تھی۔

انھوں نے جلدی جلدی رحیم کو جنگل کے درختوں کی ملکیت کا پروانہ دیا، اس سے ریاست کی فارغخطی کے کاغذ پر انگوٹھے کا نشان لیا اور ایک ہزار کے نوٹ دے کر رخصت کر دیا۔

رحیم کی ساری ترقیاں، اس کا لکڑی کا بیوپار، اس کا جنگ میں لکڑیوں کا بڑا ٹھیکہ، اس کا ہیرا چیرنے اور فرنیچر بنانے کا کارخانہ، وہ سب کچھ جو وہ بعد میں ہوا، اس کی بنا دیوان جی سے یہی لین دین ہوئی تھی۔ یہ پہلا معاملہ گویا شگون تھا اس کی آئندہ ترقیوں کا۔ اس نے شادی کی، اس کے ایک بعد ایک تین تین لڑکیاں ہوئیں اور اور تب اولاد نرینہ جگیم — اس نے لڑکیوں کی شادیاں کر دیں۔ اس نے بیٹے کو تعلیم دلوائی اور وہ خود حج کر آیا۔

لیکن یہ ہوا جب کہ اس کا سن ڈھل چکا تھا۔ جوانی تو اس نے محنت و جانفشانی ہی میں صرف کی اور پیسے پیسے کو دانت سے پکڑ کر خرچ کرنے میں۔ بیوی بھی وہ اپنی ہی سی کفایت شعار ڈھونڈ لایا تھا۔ امراؤ، ریلوے اسٹیشن کے ایک خلاصی کی لڑکی تھی۔ سات ہی برس کے سن سے ماں باپ نے اس کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ وہ

ریلوے لائن کے پاس انجن سے گرا پڑا کوئلہ چنے اور اسے دو چار آنے میں بیچ لائے۔ باپ کی اٹھارہ روپئے تنخواہ تھی اور اس کے سر امراؤ کی ماں اور امراؤ کے آٹھ آٹھ بھائی بہن تھے۔ جب اس نے گیارھویں میں قدم رکھا تو والدین نے کوئلے کے ساتھ ساتھ جنگل سے لکڑی چن لانے کا کام بھی بڑھا دیا۔ جب ذرا اور بڑی ہوئی تو لکڑی کوئلے کے خریداروں میں اور طرح کے خریدار بھی پیدا ہو گئے۔ وہ کسی کے ہاتھ بکی یا اس کے عض دام ہی لگ کر رہ گئے اس کو خدا ہی بہتر جانتا ہے، لیکن ایک دن میاں رحیم سے اس سے جنگل کی لکڑی بے اجازت توڑنے اور لیجانے پر اچھی خاصی چھین جھپٹ ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ روتی ہوئی باپ کے پاس پہونچی۔ میاں خلاصی نے بہت سے قلیوں کو لیکر رحیم پر اچھا خاصا دھاوا بول دیا۔ یہ کہتے اس نے سیری لکڑی پر ڈاکہ ڈالا، وہ کہتے، تم نے اس کی عصمت پر چھاپا مارا۔ غرض پنچوں نے طے کیا، دو بول پڑھا کر رحیم کے سر منڈھ دو۔ یہ بھی اپنے ہاتھ سے روٹیاں ٹھونکتے ٹھونکتے عاجز آ چکے تھے سوا روپئے مولوی کو دیکر اسے لال ڈوپٹہ اوڑھا کر گھر لے آئے۔ اور ایمان سے تو جہان ہے جس دن سے امراؤ اس کے گھر آئی، اس دن سے اس نے کسی مرد کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ بالکل گھر گرہستن بن بیٹھی۔ ایسا معلوم ہوتا طوفان زدہ ٹوٹی کشتی کو ساحل مل گیا۔ اب اس میں نہ تو موجوں سے پھر کھیلنے کی ہمت تھی نہ سکت اور نہ حاجت!

غرض رحیم کی جوانی اطمینان سے گذرتی۔ ہاں آرام البتہ اسے کبھی نصیب نہ ہوا مگر وہ اپنے ہی ہاتھوں۔ اس لئے کہ اس طرح کے آرام سے اس نے واقفیت ہی حاصل نہ کی جس کے معنی ہیں اپنے کام دوسروں سے لینا اور خود پلنگ کے باندھ توڑنا۔۔۔ اطمینان اسے

ہر وقت رہتا۔ اس لئے کہ اس کا خرچ اس کی آمدنی کے مقابلے میں ہمیشہ صفر رہا۔ جس زمانے میں وہ لکڑہارا تھا جب بھی اس نے روپیہ ڈیڑھ روپیہ کمایا اور چار آنے کھایا اور اب بھی جب وہ لکھ پتی تھا، اس کا خرچ اسی حساب سے تھا۔ کارخانے میں ٹھیکی پر لکڑی کے گودام میں، ٹرک پر، ٹھیلوں پر، بیل گاڑیوں پر، جنگل کی دیکھ بھال پر سب ملا کر تقریباً اسی پچاسی آدمی ملازم تھے، مگر اس کے گھر کے کام کے لیے، لڑکوں کی دیکھ بھال کے لئے، کھانا پکانا اور جھاڑ دینے کے لئے صرف ایک ملازمہ تھی ظہور یا۔ ساٹھ سے اوپر سن، نہ پیٹ میں آنت، نہ منہ میں دانت، تین روپیہ ماہوار تنخواہ، دونوں وقت پیٹ بھر کھانا۔ میاں بیوی بچوں سب کے لباس رہن سہن سب بالکل سادے۔ غذا بھی بالکل ویسی ہی۔ ایک وقت محض دال روٹی، دوسرے وقت کوئی ترکاری بھی بڑھ جاتی تھی بشرطیکہ سستی ہو۔ ایسے میں روپیوں میں برکت تو ہو ہی گئی۔

جب تینوں لڑکیوں کو کھاتے پیتے لوگوں سے بیاہ چکے تو رحیم کو فکر ہوئی عقبےٰ بنانے کی۔ کسی نے کہا کنوئیں کھدوا دو، کسی نے کہا مسجد بنوا دو، کسی نے یتیم خانہ کھولنے کی رائے دی، کسی نے اسکول قائم کرنے کی صلاح دی۔ ان سب میں اپنے علاوہ دوسروں پر روپیہ صرف کرنا ہوتا تھا۔ کسی کی بات رحیم کو پسند نہ آئی۔ اس نے حج کی ٹھانی۔ ایک ہزار میں جنت یقینی ہو جاتی تھی، اس سے بہتر کیا صورت ہو سکتی تھی اور روپیہ بھی خرچ ہوگا اپنے ہی پر!

غرض وہ حج کر آیا۔ اس نے دھوتی پہننا قطعاً ترک کر دیا اور وہ اب تہمد باندھنے لگا اور کبھی کبھی لمبے کرتے پر ٹخنوں سے اونچا چھوٹی مہری کا گھٹنا بھی پہن لیتا۔ اس نے سر کے بال استرے سے منڈوانا شروع کر دیے اور اس نے ڈاڑھی اتنی لمبی کر دی کہ وہ اچھی خاصی صلاحی

کا کام دینے لگی ۔۔۔ لیکن نہ اس نے بے ایمانی چھوڑی نہ جھوٹ بولنا چھوڑا نہ دفتروں میں، محکموں میں، عدالتوں میں رشوت دے کر اپنا کام نکالنا چھوڑا اور نہ سود پر روپیہ چلانا چھوڑا۔ وہ مسجدوں میں نمازیوں کی امامت کرتا، وہ نماز جمعہ میں برابر شرکت کرتا۔ لیکن وہ ہر شام کو بہی کھاتا اپنے سامنے جوڑ جوڑ کر دنیا میں کامیابی کا فلسفہ بیان کرتا۔

گو اس کا شین قاف درست نہ تھا مگر وہ اپنے کو بوعلی سینا کا استاد، افلاطون و ارسطو کا ہم پلہ سمجھتا تھا۔ اس کی گالی سمیت گفتگو حدیثوں اور روایتوں سے زیادہ وزنی تھی غرض والوں کے لئے وہ سب سے بڑا لائق حکیم تھا۔ اس کے اقوال موتیوں میں تولنے کے مستحق تھے وہ اپنے ملازموں سے کہتا، "اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں میاں ہو کہ بیوی، آشک ہو کہ ماشوک، باپ ہو کہ بیٹا۔ سب اپنی اپنی گرز کے بندے ہیں، اس لئے صرف اپنے سے پریم کرو۔ اپنی ہی فکر میں لگے رہو کسی کے بارے میں کبھی کچھ نہ سوچو"۔ وہ کہتا "روپیہ کے بھی دل ہوتا ہے۔ وہ اسی سے محبت کرتا ہے جو اسے چاہے، وہ لوگ جو اسے ٹھیکری کی طرح پھینکتے ہیں وہ ان کے پاس تک نہیں پھٹکتا۔

وہ کہتا "جب سود پر روپیہ دو تو اس وقت تک واپس نہ لو جب تک اصل سے دوگنا سود نہ مل جائے" وہ کہتا "لوگ بہت بھگوان بھگوان خدا خدا کرتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ وہ بھی انھیں کو چاہتا ہے جن کے پاس روپیہ ہوتا ہے۔ وہ جب بھی چاہے کھرا کھرا جنت خرید سکتا ہے۔ مولویوں سے پوچھ لو جو میں جھوٹ بولتا ہوں۔

رحیم یونہی اپنی ٹیکی پر بیٹھا ڈینگ دے رہا تھا کہ شور ہوا "آگ لگی آگ لگی"۔ اس نے پرواہ بھی نہ کی، ہوگی لگی کہیں آگ۔ بسے کیا۔ اس کے ہاں تو سب خیریت ہی خیریت تھی۔ وہ حقہ سے مزہ لیتا رہا اور اس نے گرد بیٹھے ہوئے ملازموں کو نصیحت کی۔ اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ کیوں کسی کے لئے اپنے کو پریشانی میں ڈالو۔ جس کے ہاں آگ لگی ہے وہ خود دیکھ لے گا۔ غرض وہ آدھ گھنٹہ تک نہ وہ اپنی جگہ سے ہلا اور نہ کسی کو اس نے اپنی جگہ چھوڑنے کی اجازت دی۔ وہ انھیں اپنا زرّیں فلسفہ سمجھا رہا تھا۔ ایسے میں آگ بجھانے جانا اور اس کے پند و نصائح سے بے بہرہ رہ جانا حد درجہ بیوقوفی ہوتی۔ لیکن اس کی تقریر تمام ہی تھی کہ دفعتہً محلہ کا ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ "ارے سیٹھ رحیم تم بیٹھے ہو اور وہاں حکیم بھیا بھی جل گئے اور سیٹھانی بھی۔"

رحیم کو جیسے بجلی مار گئی۔ اس نے تین بار اُٹھنے کی کوشش کی اور تینوں بار وہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔ اور نہ اس کی زبان سے کوئی لفظ نکل سکا۔

جب لوگوں نے جھنجھوڑا کہ سیٹھ رحیم اُٹھو، چلو تو وہ پلنگ پر بے ڈول گر پڑا اور بڑی کوشش سے بولا "گھر"۔ لوگ اسے پلنگ سمیت اُٹھا کر گھر لے آئے۔ وہاں دو پلنگوں پر دو جلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ کسی نے انپر چادریں ڈال دی تھیں مگر چراند تھی کہ الامان والحفیظ۔ معلوم ہوا بیٹا ماں کو ٹرک پر بٹھا کر سیر

کرانے کے لئے گراج میں لایا تھا وہاں بے خیالی میں جلتی دیا سلائی پٹرول کے ٹن کے قریب پھینک دی۔ آگ لگی تو محلے والوں نے ایک چیخ تو سنی اور اس کے بعد اگر کوئی آواز تھی تو وہ دہنیوں کے پٹخنے، اثاثہ کے جلنے اور بڑھیا کے بین کی۔ اور بس!

حاجی سیٹھ رحیم اب بھی آپ کو اپنے کارخانے اور گھر کے قریب سڑک کے کنارے زمین پر بیٹھے ہوئے ملیں گے۔ ان کے سر کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے ہیں، آنکھوں میں کیچڑ بھری ہوئی ہے، ان کی ناف سے نیچی سفید ڈاڑھی باچھوں سے بہتی ہوئی پان کی پیک سے داغدار ہے۔ ان کے کپڑوں میں غلاظت لگی ہوئی ہے۔ ان کے پاس چھوٹا بیت پڑا ہے۔ اس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ لوگ شام وسحر ان کے پاس آتے ہیں۔ عقیدت سے ہاتھ جوڑ کر ان کو مٹھائی کھلاتے ہیں، پان کھلاتے ہیں اور ان سے اپنی اپنی حاجت ومطلب برآری کی دعا چاہتے ہیں۔ وہ کبھی پان کچلتے کچلتے آخ تھو کر کے کسی پر تھوک دیتے ہیں تو اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے اور کبھی کسی سے سب کچھ لیکر کھا لیتے ہیں مگر کچھ نہیں بولتے تو وہ بے مراد پلٹ جاتا ہے۔ ان کے گرد مراد مانگنے والوں کا اسی طرح ہجوم ہے جس طرح ان کے پاس بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کا۔

مگر رحیم کی اس آخری منزل کے بارے میں ہماری کیا مجال ہے
کہ ہم رائے زنی کر سکیں۔ رحیم اب نہ صرف سیٹھ ہے، نہ صرف
حاجی بلکہ خدا کی خدائی میں برابر کا حصہ دار!

۱۹۵۱ء

رامو اور اس کا پورا خاندان اس وقت کیاری میں سبھدئیں کا بہن بیٹھا رہا تھا۔ اگست کی آخری تاریخیں تھیں، رات بھر خوب مینہہ پڑا تھا۔ مٹی کی کچی دیواریں کٹ کٹ کر گر گئیں تھیں۔ بھوسن کے چھپر بھیگ کر دوہرے ہو گئے تھے۔ گاؤں کے تالابوں، گڑھیوں میں میلے، گندے پانی کی چادر اب بھی گر رہی تھی مینڈھک خوشی سے بے قابو ہو کر بے سُری آوازوں میں الاپ رہے تھے۔ پو پھٹ رہی تھی، ہوا ذرا تیز ہو گئی تھی۔ اس لئے پانی کا زور کم ہونے لگا تھا۔ کالے کالے بادل آگے والے مورچے پر چڑھائی کے لئے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بجلی چمک چمک کر انھیں کوڑے لگا رہی تھی۔ اس کی روشنی میں رم جھم برسنے والے پانی کی بوندیں جگنو کی طرح چمک اٹھتیں۔ کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا، جیسے آبِ رواں کے گہرے دھانی رنگ ہوئے دوپٹہ پر روپہلے ستاروں کی ایک گھنی ٹیڑھی لکیر ٹانک دی گئی ہے۔

یہی وجہ تو تھی کہ رامو، بیوی، بہو اور بیٹی سمیت کیاری میں گھسا دھان "روپ" رہا تھا۔ رامو کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ یہی چالیس پچاس کے درمیان۔ لیکن اس کے اکثر دانت ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی تھیں۔ اور

وہ دوہری ہڈی والا ہونے پر بھی کمر سے جھک گیا تھا۔ اس کی سوکھی پنڈلیاں اور اس کی ننگی پیٹھ پر لمبے لمبے سفیدی مائل داغ اس بات کے گواہ تھے کہ وہ بھوکا بھی رکھا گیا ہے اور بیدوں سے مارا بھی گیا ہے۔

اس کی بیوی رجیا پینتیس چھتیس برس کی تھی۔ اک نقشہ بھی اچھا نہ تھا۔ رنگ بھی کالا تھا۔ اس میں وہ کس بل بھی نہ تھا جو جوانی کی خصوصیت ہے۔ لیکن اس وقت حسب منشا، کام کرنے کی اُمنگ سے اس کا عضو عضو پھڑک رہا تھا اور اس کی دھنسی دھنسی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

دس برس کی دھنیا ایک پنکھڑی تھی۔ مائل بہ سیاہی، گندمی رنگ، ناچتی ہوئی شرارتی آنکھیں، بوٹا سا قد، دبلی پتلی لیکن اس میں بالکل ایک تتلی جیسی چلبلاہٹ تھی اور ایک نیل گوں بھنورے جیسی بھنبھناہٹ تھی اور گول مول بدھیا رامو کی بہو، یقینی جوان تھی لیکن بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ تازگی کھو چکی تھی۔ جو نئے سہاگ کی علامت ہے۔ اس کی قطع بالکل خاک پر پڑی ہوئی گولر کی تھی، اندر رس بھرا ہوا لیکن جلد میں نہ تو چمک نہ چکناہٹ۔

رامو نے سر پر ایک پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اور چھوٹی سی دھوتی کو رانوں تک چڑھا لیا تھا۔ عورتوں نے ساڑی کا آنچل لپیٹ لیا تھا۔ اور آگے چنے ہوئے حصے کو سمیٹ کر نیچے کھونس لیا تھا۔ ان کی بھری اور سوکھی پنڈلیاں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں ان کے ہاتھ کہنیوں تک کیچڑ میں اٹے ہوئے تھے۔ رامو آدھے سے زیادہ کھیت ہل چلا چکا تھا۔ پانی زمین کے چاک کو گویا مرہم لگا کر برابر کرتا جا رہا تھا۔ رجیا اور بدھیا اپنی منھی کا بہن، کھیت کی مٹی میں منتقل کرنے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔

یہاں یہ سوکھ جاتا وہاں وہ بڑھے گا پھیلے گا، سکے گا، کُٹتا جائے گا، اور پھر چاول بن کر ہزاروں انسانوں کے پیٹ بھرے گا۔ کتنا قاتل ہے ہمارا ہاتھ اور کتنی زندگی بخشنے والی ہے یہ حقیر مٹی!

بہن، مینڈھ پر رکھا تھا، چھوٹی دھنیا بھی کھڑی تھی کہ دوڑ کر جائے اور اسے لاکر ملّی اور سکھوجی کے ہاتھوں تک پہنچا آئے وہ اس درمیان میں مڑ مڑ کر یہ بھی دیکھ لیتی کہ چار برس کا بھتیجا کمل کی تہوں میں چھپا اور تاڑ کے پتوں سے ڈھکا اب بھی سو رہا ہے کہ نہیں۔

آج پورا گھر کھیت پر تھا، وہ گھر میں کیسے اکیلا چھوڑ دیا جاتا۔ پھر وہی تو اس کھیت کھلیان کا ہونے والا وارث تھا۔ اس کو تو اسی کیچڑ، مٹی اور پانی میں پوری زندگی بتانا تھی!

دفعتہً سورج کی سنہری تھالی کا ایک ٹکڑا پورب میں جھلکا۔ رات کی کالی ساری پر سنہری لیس ٹکی۔ پورا کھیت سنہری رنگ میں نہا گیا۔ اور ناگوری بیلوں کے کندھوں پر لگی ہوئی زردی سے نئی رنگینی کی طرح جگمگا اٹھی۔ رامو ذرا سا مسکرا دیا۔ پگڑی ٹیڑھی کر کے اس نے بیوی کو دیکھا اور ہلکے ہلکے جھوم کر للکارا۔

"دھنیا کی ماں! سویرا ہو گیا۔ اب شرو (شروع) کیوں نہیں کرتیں!"

جھکی ہوئی رجیا تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ جھٹکا کر کہا: "تم سے کھد (خود) کام ہوتا نہیں اور الجام دیتے ہو دوسروں کو۔ تم کھیت سے بیل نکالو۔"

رامو نے کہا۔ "ارے تم ادھر شرو (شروع) کرو نا۔ میں جو باکی ہے وہ ابھی کھتم کیے دیتا ہوں۔" اس نے بیلوں کی دُم اینٹھی "آ دُرے بیٹھو! سا باس!" اور

بیل تیز چلنے لگے ــــــ بیل کے چلنے کی وجہ سے پانی میں "ہڑ بڑ، ہڑ بڑ" کی آواز
دھنیا کا چھپ چھپ دوڑنا، رامو کا بیلوں کو بار بار چمکارنا، للکارنا۔ رجیا کا میاں کے
مقابلہ میں جلدی کرنے سے دم پھولنا، ان بڈھوں کے بالک پن پر بڑھیا کی کھل کھلاہٹ
ہلکا ہلکا مینھ، ٹھنڈی ہوا، اور ایسے میں تاریکی کو ہٹاتی، دیے باؤں آتی ہوئی
روشنی، پھر مینڈھ پر ڈھیر "بہن" کا سبزہ دار لہکنا اور دُور کے بھیگے ہوئے درختوں
پر چڑیوں کا چہچہانا، ایک عجیب دلکش منظر تھا۔ رامو اس قدر خوش تھا کہ وہ دل ہی
دل میں ایک دیہاتی گیت گانے لگا ــــ اتنے میں بڑھیا نے ہارتی ہوئی سانس کی
دلدہی کے لئے کہا: "ارے کاہے ہلکان ہو کا گی۔ جلدی کاہے کی ہے! اب تو اپنا ہی
کھیت ہے"

اور رامو کو وہ زمانہ یاد آگیا جب کھیت اپنا نہ تھا۔ ۱۹۴۲ء میں جون کا مہینہ
تھا کہ زمیندار نے کہا، "دھان کی کیاریاں چھوڑ دو۔ مہندر ہمیں نذر بھی دے رہا ہے
اور تم سے دگنا لگان بھی۔ اب یہ کیاریاں وہی جوتے گا" رامو نے خوشامد کی
گڑگڑایا، وہ اکڑتے ہی چلے گئے۔ آخر اسے بھی غصہ آگیا۔ اس نے کہا۔
"باپ دادا کے سمے سے یہ کیاریاں ہماری دخیل کاری میں ہیں۔ ہم پر کبھی لگان
باقی نہ رہا، آپ اسے ہم سے نکال نہیں سکتے" وہ ان کی گالیاں اور گھڑکیاں سن کر
گھر چلا آیا۔ لیکن رات بھر یہ سوچتا رہا کہ کیا صورت ہو کہ برسات سے پہلے ہی وہ کھیتوں پر
ہل چڑھا دے! اتفاق سے ایسا ہوا کہ یا تو کہیں دُور دُور بادل کا نام نہ تھا یا دفعتہً
بارہ بجے رات کو ہوا چلی اور اُتر سے گھر گھٹائیں آئیں۔ تین گھنٹے اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر
پانی برسا کہ سارے میں جل تھل ہو گیا۔ رامو نے مینھ رکتے ہی بیٹے، بیوی، بہو،

بیٹی، سب کو ساتھ لیا۔ اور اسی وقت پانی سے بھری کیاریوں میں ہل چلایا اور دھان چھڑک دیا۔ یہ سارے کام اس پھرتی سے کئے گئے کہ صبح کے دھندلکے سے پہلے ہی سارا کنبہ گھر پلٹ کر آرام سے لیٹ رہا۔

صبح کو جب زمیندار کو خبر ہوئی تو وہ بہت جز بز ہوئے انھوں نے مہندر سے کہا کہ وہ جا کر کھیت پلٹ دے۔ وہ اپنا پورا جتھا ساتھ لیکر آیا۔ لیکن دوسرے کسانوں نے لعنت ملامت کی اور وہ اس وقت گاؤں والوں کا پاس کر کے واپس چلا گیا۔ لیکن دس ہی دن بعد جب دھان کے پودوں نے تیلی تیلی گردنیں نکال کر ایک زمردیں فرش سے ڈھک دیا تو مہندر اور اس کے ساتھیوں نے ساری کیاریوں میں مویشی ڈال کر انھیں کچلوا اور چروا ڈالا۔ وہ صبح بھی کتنی غم آلود تھی، جب ایک پڑوسی نے رامو کو جھنجھوڑ کر جگایا اور یہ سنائی کہ اس کی ساری کیاریاں برباد ہوگئیں اور اس کی محنت پر پانی پھر گیا اس کے بیٹے رام پرشاد کی تو یہ حالت تھی کہ وہ غصے سے اپنی بوٹیاں نوچتا اور بار بار لاٹھی اٹھا کر کہتا، "آج میں مہندر کو مار ڈالوں گا، اس نے ہماری روزی ہم سے چھین لی"

رامو نے بڑی مشکل سے اسے روکا تھا اور اسے ساتھ لیکر شہر کی طرف چلا تھا کہ تھانے میں رپٹ لکھوائے گا، کچہری میں دعویٰ کرے گا ـــــ اور راستے ہی میں خبر ملی کہ مہاتما جی رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح پکڑ لئے گئے اور سارے نیتا ایک ایک کر کے قید کر لئے گئے۔ رام پرشاد اور رامو قومی غم و غصہ میں نجی غم و غصہ بھی بھول گئے۔ سب کے ساتھ وہ بھی سوچنے لگے کہ "ہتھیارے انگریز" باتوں سے نہیں مانیں گے۔ ان کو لاٹھی ہی درست کر سکتی ہے۔ ان سے حکومت زبردستی چھیننا پڑے گی۔ خبر دینے والا ایک مجمع تھا۔ معلوم ہوا یہ سب پاس والی تحصیل پر قبضہ کرنے اور ظالم

تھانیدار کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں۔ رامو اکیلا ہوتا تو شائد اس طرح کی دہشت انگیزی میں حصّہ لینے کے لئے تیار نہ ہوتا، لیکن جوان بیٹا بھی ساتھ تھا۔ آج صبح سے وہ مارنے پر تُلا تھا۔ اس کو کیسے اکیلا چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ بھی بھیڑ کے ساتھ بہہ گیا۔ وہاں۔۔۔ تھانیدار کو پہلے ہی خبر مل گئی تھی۔ اس نے تھانے کی چھت پر اور خفیہ کمین گاہوں میں مسلّح سپاہی بٹھا رکھے تھے۔ مجمع کے تیور دیکھتے ہی اس نے گولیوں کی بارش کر دی۔ پانچ سات تو وہیں ٹھنڈے ہو گئے اور بیسیوں زخمی ہو کر تڑپنے لگے۔ ان لوگوں میں سے جو پہلے گولی کا نشانہ بنے، رام پرشاد بھی تھا۔ رامو اسے تڑپتا اور کراہتا ہوا کندھے پر لاد کر جلدی سے پیپل والے کھیت میں بھاگا۔ امید تھی کہ زخم شاید کاری نہ لگا ہو، لیکن جب اس نے اپنے بیٹے کو زمین پر لٹایا تو وہ مر چکا تھا۔ رامو کی آنکھوں میں ساری دنیا تاریک ہو گئی۔ وہ جس سے اس کا خاندان چلنے والا تھا، وہ کہ جسے اس نے غربت میں ہزاروں دکھ سہہ کر پروان چڑھایا تھا، وہ جس سے اس کی مستقبل کی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ یوں چشم زدن میں جان توڑ دے اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ پھر وہ اپنی بیوی، اس کی ماں کو کیا جواب دے گا؟ وہ اپنی بہو، اس کی جوان بیوہ کو، کیسے منہ دکھائے گا؟

گولی چل رہی تھی، مجمع ڈھیلے پھینک رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا۔ تھانے پر چھڑکنے کے لئے مٹی کے تیل کا انتظام کر رہا تھا۔ شور تھا، چیخ تھی، کراہ تھی، لیکن رامو ایک بُت کی طرح بیٹے کی لاش کے سرہانے بیٹھا رہا۔۔۔ پھر وہ ایک بار اٹھا، اس نے رام پرشاد کی لاش پھر کندھے پر لادی اور لاٹھی ٹیکتا ہوا دریا کی طرف چلا۔ گنگا تھانے کی پشت پر دو فرلانگ کے فاصلے پر بہہ رہی تھی۔ وہ ہانپتا ہوا یہ قیمتی بوجھ

کنارے لایا۔ چاروں طرف نظر ڈالی، کہیں سوکھی لکڑی نظر نہ آئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر "ماتا" کو سلام کیا، لڑکے کی پیشانی چومی اور اسے گنگا کی گود میں دے دیا۔

وہ بھیگے تو آہستہ آہستہ تھانے کی طرف چلا، اس کا بیاختہ جی چاہتا تھا کہ وہ بھی کسی طرح خون میں رنگ جائے شائد کھویا ہوا رام پرشاد اسی صورت میں مل سکے گا مگر دفعتہً اسے بیوی اور بہو یاد آئی۔ دونوں منتظر ہوں گی، دونوں دیر ہو جانے سے پریشان ہوں گی۔ دونوں کچہری تھانے سے ڈرتی ہیں، نہ جانے کیا کیا سوچتی ہوں گی۔ ان تک پہونچنا بہت ضروری ہے۔ بیٹے کی جان تو گئی ہی، ان سب کو ہلاکت میں ڈال دینا کسی طرح مناسب نہ ہوگا ــــــــــ اس لئے وہ گاؤں کی طرف پلٹ پڑا۔

اندھیرا ہو گیا تھا، رات کا سناٹا آہستہ آہستہ بڑھنے لگا تھا، بس کبھی کبھی گولی دغنے اور خانہ ساز پٹاخوں کے چھوٹنے کی آوازیں آتیں۔ کبھی کبھی کسی بڑی تیز ترچیخ کی، جیسے کوئی کڑیل جوان تڑپ تڑپ کر جان دے رہا ہو۔ وہ کانپ اٹھتا تھا اس کی کنپٹیاں دھکنے لگتی تھیں، اس کے ہاتھ بھینچ جاتے تھے، مگر وہ نہ تو ٹھٹکتا تھا نہ پلٹ کر دیکھتا تھا۔ وہ تو سننانی سُنانے جارہا تھا۔ وہ تو سب کچھ کھو کر آرہا تھا۔ اس کی امیدوں کے سارے رشتے ٹوٹ چکے تھے، اب وہ کیوں مڑتا، کس پیچھے آنے والے کا انتظار کرتا! ـــ

رات کے دس بجے جب اس نے اپنے جھونپڑے میں بیوی اور بہو کو خبر سنائی تو سارا گاؤں ان کی چیخ سے گونج اٹھا۔ سب اپنے بستر چھوڑ کر دوڑ پڑے۔ یہاں تک کہ زمیندار کا کارندہ بھی پوچھنے آیا کہ کیا بات ہے۔ جس نے سُنا اس نے آہ بھری۔ ہر ایک انگریزوں کو کوسنے اور گالیاں دینے لگا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ رام پرشاد

کے مارے جانے سے کسی پر خوف طاری نہوا بلکہ ہر شخص غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ رامو تو برابر بیوی اور بہو کو سنبھالنے میں لگا رہا۔ لیکن ایک ہفتہ تک گاؤں کے مختلف نوجوان، تھانوں اور تحصیلوں کے حملوں میں حصہ لیتے رہے۔ امہندر کے گروہ نے اس موقعہ سے بھی فائدہ اٹھایا، اس نے اوڑ پہاڑ کے پاس مالگاڑی کے کئی ڈبے لوٹ لئے اور گاؤں میں کئی دن نئے نئے موزوں، رومالوں، بنیائنوں کی خاصی طور پر بہار رہی۔ ٹھاکر صاحب گھر پر نوکروں کا پہرا بٹھا کر بیوی بچوں کو لیکر شہر چلے گئے تھے۔ اب کوئی حاکم نہ تھا، اس لئے نوجوانوں کا راج تھا۔

کوئی دس دن بعد خبر ملی کہ گوروں کی پلٹنیں آگئی ہیں اور ایک بڑا ہی ظالم انگریز افسر بھیجا گیا ہے۔ وہ ہر طرف گولیاں چلاتا، کوڑے مارتا اور آگ لگاتا جاتا ہے۔ قصوروار اور بے قصور دونوں کو یکساں موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔ بنیائنیں موزے اور لوٹی ہوئی چیزیں آہستہ آہستہ غائب ہونے لگیں اور ہر شخص اپنی اپنی جان بچانے کی سوچنے لگا۔ پندرھویں دن دو لاریوں میں لدے ہوئے بیچ بیچ انگریز آپہونچے اور ان کے پیچھے پیچھے ایک موٹر میں ڈپٹی صاحب اور گاؤں کے زمیندار ٹھاکر رام پال سنگھ۔

گوروں نے گھر گھر تلاشی لے ڈالی۔ چیزیں پہلے ہی ہٹا دی گئی تھیں یا کنوؤں تالابوں میں پھینک دی گئی تھیں یا زمین میں بہت گہری گاڑ دی گئی تھیں۔ کچھ نہ ملا۔ ٹھاکر صاحب نے سب کی سفارش بھی کی، صفائی بھی دی۔ لیکن رامو سے تو خفا تھے ہی۔ رام پرشاد کے مارے جانے کا قصہ نمک مرچ لگا کر بیان کر دیا۔ رامو پکڑا گیا پیٹا گیا۔ گوروں نے ٹھوکریں مار مار کر رجیا، بدھیا اور دھنیا کو بے حال کر دیا۔

پھر ان کو چھپر سے کھینچ کر باہر نکالا اور اس میں آگ لگا دی۔ تھانے میں پھر رامو پر خوب بید پڑے۔ پولیس والے چاہتے تھے۔ وہ ان لوگوں کا نام بتا دے جو تھانے اور تحصیل کے حملے میں شریک تھے۔ رامو نے سارے ظلم خاموشی سے برداشت کر لیے لیکن کسی کا نام نہ لیا۔ اسے سات برس کی سزا ہو گئی اور وہ نینی جیل کے اسپتال میں پورے پانچ مہینے پڑا رہا۔ جب کہیں جا کر اس قابل ہوا کہ آہستہ آہستہ چل کر چھوٹے موٹے کام کر سکے۔

اس درمیان میں ضلع کے اور بہت سے لوگ پکڑ کر آئے۔ نیتا بھی چھوٹے چھوٹے کانگریسی بھی، سچ مچ کے بدمعاش بھی، بے قصور نیک جین بھی۔ اسے ان کی زبانی بہت سے حالات معلوم ہوئے۔ انگریزی فوج نے کیسے کیسے ظلم توڑے اور ہندوستانی سپاہیوں نے کس کس طرح ہاتھ صاف کیے لیکن کسی سے یہ معلوم ہو سکا کہ رجیا پر کیا گذری، بدھیا کے جو بچہ ہونے والا تھا وہ لڑکا ہوا یا لڑکی اور دھنیا اب کتنی شریر ہو گئی ہے۔ اسی طرح ایک سال گذرا، دو سال گذرے، تیسرا سال بیتا، چوتھا سال آیا اور خبر آئی کہ نیتا چھوڑ دیے گئے۔ پھر خبر آئی الکشن ہو رہا ہے۔ پھر خبر آئی، اپنی قومی حکومت ہو گئی۔

۱۹۴۶ء کی جنوری میں رامو چھوٹا۔ وہ ریل سے اتر کر گاؤں کی طرف چلا تو یہی سوچتا رہا کہ جاتا تو ہوں مگر وہاں کیا ملے گا اور ہوا بھی یہی۔ جب گاؤں پہنچا تو دیکھا۔ اس کے چھپر کی جگہ ایک مٹی کا ٹیلا ہے اور نہ رجیا ہے نہ دھنیا۔ معلوم ہوا اس نے بدھیا کو بھیج دیا اور خود بھی بھائی کے پاس دوسرے گاؤں میں ہے۔ رامو صرف چند گھنٹے گاؤں میں ٹھہرا۔ وہ پلٹ کر شہر کے

کانگریس منڈل میں چلا آیا بستری سے نینی جیل میں ملاقات ہو چکی تھی۔ انھوں نے بڑی ہمدردی کی۔ کلکٹر سے ٹھاکر صاحب پر زور ڈلوایا رامو کی کیاریاں اسے واپس دلائیں بلکہ دس بیگھے اوپر سے۔ سرکار کی طرف سے ایک ہزار معاوضہ بھی دلوایا۔

رامو نے رجیا کو بلایا، بڑھیا کو جاکر لے آیا، وہ آئی تو ساڑھے تین سال کا منوہر بھی آیا۔ عجیب بات تھی وہی رامو جو رام پرشاد کے مرنے پر نہ رویا تھا، جو اٹھارہ سال کی کمائی کو اپنے ہاتھ سے گنگا میں بہا دینے پر ٹس سے مس نہ ہوا تھا جس نے بید کھانے، بے گھر ہونے اور قید کئے جانے پر آنسو نہ بہائے تھے جب اس نے پہلی بار پوتے کو دیکھا تو اس بھولے کے مسکرا دینے پر اس طرح رویا کہ جیسے پوتے پر آنکھ پڑتے ہی ساری برباد یاں ایک ایک کر کے سامنے آتی چلی گئیں۔

آج اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں۔ وہ ٹھٹک کر آنکھ صاف کرنے لگا۔ رجیا نے جھک کر گیلی مٹی اٹھائی اور اس کو سیاں کی ننگی پیٹھ پر کھینچ مارا۔

"کیا کھڑے سو رہے ہو"

بڑھیا ہنستی ہوئی منڈیر کی طرف لپکی، جدھر منوہر تاڑ کے پتے کے نیچے سے جھانک کر پکار رہا تھا "ماتا! ماتا جی!"

اور بوڑھا رامو بیلوں کو چھوڑ کر کیچڑ میں بھری قدم رکھتا ہوا وہاں آیا جہاں رجیا کھڑی ہوئی اسے تک رہی تھی۔ رامو نے ہاتھ کی گیلی مٹی رگڑ کر بھرائی اور اس کا چورا بہو کی مانگ میں بھر دیا۔ وہ کچھ لجائی، کچھ شرمائی، کچھ جھنجھلائی۔ اس نے کہا "یہ کیا ہے؟ سر بھر میں مٹی لپیٹ دی۔"

رامو نے ہنس کر کہا "ارے مورکھ! دس سے پوتر اور کون سیندور ہوگا؟ یہ اپنے کھیت، اپنے دیس کی مٹی ہے!" ــــــ اور رجیا کے جھکے ہوئے سر کی مانگ اس طرح چمکنے لگی جیسے وہ سچ مچ افشاں اور صندل سے بھری ہو!

سنہ ۱۹۵۳ء

.... اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لئے ہاتھ بڑھایا! ......

میں ڈاک بنگلے میں بالکل اکیلا تھا۔ بہاری میرا اردلی، قریب کے ایک گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہر گیا تھا۔ سرکاری خانساماں جو بنگلے کی چوکیداری کے فرائض بھی ادا کرتا تھا مجھے رات کا کھانا کھلا کر کسی سے ملنے قصبہ میں چلا گیا تھا۔ آبادی ڈاک بنگلے سے نصف میل دوری پر تھی انگریز حاکم کالے آدمیوں میں مل جل کر رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے محکمۂ نہر کے انگریز انجینیر نے یہ بنگلہ کالے آدمیوں کی نظر بد سے بچانے کے لئے ان کے قصبے سے فاصلے پر بنایا تھا۔ بنگلے کی تین طرف ارہر اور ایکھ کے کھیت تھے، چوتھی طرف نہر تھی۔ نہر کے اس پار ایک فرلانگ کے فاصلے پر ڈھاک اور جھاؤ کا جنگل تھا۔ یہاں لومڑی گیدڑ، لکڑ بھگوں اور بھیڑیوں کے بھٹ تھے۔ نہر بیچ میں نہ ہوتی تو شاید یہ بنگلہ ان کا رمنہ بن جاتا۔

رات بچپنے سے نکل کر جوانی میں قدم رکھ چکی تھی۔ شام کی چلبلاہٹوں پر گہری تاریکی کی متانت غالب آتی جا رہی تھی۔ بنگلے پر ایک سناٹا سا چھایا تھا۔ ارد گرد کی فضا پر بھی وہ سکوت طاری تھا جو دس بجے شب کے قریب دیہاتوں، جنگلوں اور غیر آباد مقاموں کو بھیانک بنا دیتا ہے۔ اس سناٹے اور خاموشی کے پردے کو

کبھی کبھی لکڑ بھگوں کی قہقہہ نما چیخ چاک کر دیتی تھی یا کسی گیدڑ کی انسان نما پکار یا کسی اُلو کی بھیانک آواز!

میں نووارد تھا۔ ضلع کی خصوصیات سے ناواقف۔ میرے لئے ماحول بھی نیا تھا اور مقام بھی۔ نہر کے ماتحت انجینیر کی حیثیت سے اُس شام تیس میل کے دورے سے پلٹا تھا۔ یکہ کی سواری نے، پختہ اور نیم پختہ سڑکوں کے ہچکولوں نے جسم کو چور چور کر دیا تھا۔ تھکن کا تقاضا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاؤں۔ لیکن فوراً غافل نہ ہو سکا۔ نیند کی دیوی آئی مگر خراماں خراماں اور دل و دماغ میں اپنے جھولے ڈالنے کی جگہ بس پلکوں کو چُھو کر چلی گئی۔ میں الف لیلہ کا "سوتا جاگتا ہارون" بن گیا۔ وہی عباسی جو رام چندر جی کی طرح رعایا کا دُکھ سُکھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے راتوں کو بھیس بدل کر نکلتا تھا اور جس کی راتیں ہمیشہ چھوٹی اور دن بڑے ہوتے تھے۔ اور میرے دل میں ہارون جیسا ڈر بھی تھا۔ اس لئے کہ جس طرح وہ اپنے معمولی لبادے کے نیچے کمر میں مرصع تلوار لٹکا لیتا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی پلنگ کی پٹی سے دو نالی بندوق لگا رکھی تھی۔ اسے انسانوں کا ڈر مسلح ہو کر باہر نکلنے پر مجبور کرتا تھا، میرے دل کو جانوروں کے خوف نے بندوق پاس رکھنے پر مجبور کیا تھا۔ اودھ کے بعض ضلعوں میں لکڑ بھگوں اور بھیڑیوں نے ان دنوں آفت مچا رکھی تھی۔ نہ جانے کتنی جانیں ان کی خون آشامی کا شکار ہو چکی تھیں اور ان کے تیز ناخنوں اور دانتوں کے نہ جانے کتنے زخمی اسپتالوں میں تھے۔ ایسے میں بندوق اپنے پاس ہوتے ہوئے اپنے قریب نہ رکھنا قرین عقل بات نہ تھی۔

جب نیند، ساقی کی طرح مجھے بار بار لٹکا کر، نہ آئی تو میں نے بستر کے قریب

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

چھوٹی میز پر رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی تیز کی۔ اور اپنی کتابیں اُٹھائیں۔ اس دورے میں تین کتابیں ساتھ لایا تھا۔ پریم چند کی پریم پچیسی، سمرسٹ ہام کی ریزرس ایج اور اناطول فرانس کی پنگوئن آئیلینڈس۔ یہ کتابیں بار بار کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن مجھے پریم چند کی جرأت، غیرت، حمیت، شرافت و محبت کی کہانیاں دل سے پسند تھیں۔ ان سے کردار بنتے تھے۔ ان سے سیرتیں درست ہوتی تھیں ان سے مزاجوں میں توازن اور اعتدال پیدا ہوتا تھا۔ وہ آجکل کی کہانیوں کی طرح تحلیل نفسی کا نسخہ یا سیاسی تحریکات کا پروپیگنڈا نہ ہوتی تھیں۔ پریم چند نے انسانیت کے خیر فانی قدروں کو کہانی کا روپ دیا تھا اور اسی لئے وہ امر تھا۔ اناطول فرانس کی ساری تصنیفوں میں مجھے پنگوئن آئیلینڈس، اس کا تمثیلی ناول حد درجہ پسند تھا۔ طنز کا یہ شاہکار موجودہ تہذیب کے ارتقاء کی مکمل تاریخ ہے۔ حال ہی میں پریسیڈنٹ ٹرومین نے جو بجٹ کے سلسلے میں اپنی کانگریس کو سفارشات کی ہیں اور جس طرح امریکہ کے بجٹ کو سارے عالم کا بجٹ بنا دیا ہے اس کا خاکہ اسی ناول کے آخری ابواب میں بڑے پیارے انداز میں موجود ہے۔ میں بار بار اس حصے کو پڑھتا تھا اور اس ادیب کی حیرت انگیز سیاسی سوجھ بوجھ پر انگشت بدنداں رہ جاتا تھا۔

ریزرس ایج میں ہیرو کا استغنا عجیب و غریب ہے۔ وہ نہ صرف دولت و ثروت کی جانب سے مستغنی ہے بلکہ حسن و جنس کے معاملے میں بھی بے حس و بے پروا ہے۔ محبوبہ اگر پیار سے کام لیکر اس سے شادی کر سکتی ہے تو وہ خوش، اگر وہ دولت کے لالچ میں کسی اور رشتے میں منسلک ہو جاتی ہے تو اسے کوئی شکایت نہیں۔ سزا یافتہ چور اور مستند غنڈے اس کی ہمدردی کے مستحق اور جانی بوجھی بدکردار عورتیں اس کی

سرپرستی کی حقدار ۔ اگر ان میں سے کوئی احسان کا بدلہ احسان سے دینا چاہتی ہے تو اسے معاوضہ قبول کرنے سے کوئی انکار نہیں ۔ اگر کوئی خود ہی اصرار کر کے وعدے سے پلٹ جاتی ہے تو اسے کوئی شکایت نہیں ۔

میں ویزرس لاج کی جلد پر ہاتھ رکھے اس کے اس عجیب کردار پر اور اس کی انوکھی تکنیک پر غور کر رہا تھا کہ نہ جانے کیوں مجھے شاد عظیم آبادی کا مشہور شعر یاد آ گیا ؎

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

اور میرا دماغ انسانی جسم و روح کے مابعد الطبیعاتی مسائل میں الجھ گیا ۔ یہ "میں" کون سی چیز ہے ؟ گوشت و پوست کا مجموعہ یا کچھ اور ! روح محض حرارتِ جسمی ہے یا اس سے الگ کوئی اور شئے ؟ اگر محض حرارت ہے تو انسانی دماغ اپنے مثلی کے پیدا کرنے میں اب تک کامیاب کیوں نہیں ہوا ! اگر جسم سے علحدہ کوئی شئے ہے تو اسے قفسِ عنصری میں کون بند کرتا ہے کون نکالتا ہے ۔ پھر یہ روح پیدائش سے پہلے کہاں تھی ؟ مرنے کے بعد کہاں جاتی ہے ؟ کیا سر کانن ڈائل اور سر الیور لاج جیسے روحانیین کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ روحوں کو بلا سکتے ہیں ، ان سے باتیں کر سکتے ہیں ، ان کا دھندلا دھندلا سا فوٹو کھینچ سکتے ہیں ۔ بس ـــــ اور مجھے کچھ تصوف کی باتیں یاد آئیں ، کچھ ویدانت کی ، کچھ تھیوسوفی کی ، کچھ سائنس کی ـــــ اور میں نے الجھ کر لیمپ کی روشنی کم کی ، آنکھیں بند کیں اور نیند بلانے کے لئے میں شاد کے مصرعہ کو دہرا دہرا کر اس سے لوری کا کام لینے لگا ع

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم! نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!......

دفعتہً کمرے کے کھلے دروازے سے ایک شخص جھانکا۔ بڑے بڑے اُلجھے اُلجھے بال، لمبی کھچڑی داڑھی اور دھنسی دھنسی چمکتی آنکھیں!......

میں نے ڈر کو دل میں چھپاتے ہوئے پوچھا "کون ہے؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کمرے میں چلا آیا۔ بھیانک چہرہ، پھٹی قمیص، پھٹا پائجامہ، ننگے پاؤں، سارے جسم اور کپڑوں پر گرد جمی ہوئی، اس پر اس قدر لاغر کہ معلوم ہوتا ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے یا کوئی مصری ممیائی۔ میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا، حلق سوکھنے لگا اور مجھے پسینہ چھوٹنے لگا۔ میں نے پھر بھی افسرانہ لب و لہجہ میں پوچھا۔

"کون ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟"

"پانچ پیسے!" وہ پہلی بار بولا۔

بھیک مانگنے والے میری چڑھ ہیں۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا انسانیت کی سب سے بڑی توہین ہے اور بے حیائی اور بے غیرتی کی آخری حد!

میں نے اس لیے جھڑک کر کہا "تو اندر کیوں گھسا آرہا ہے؟ دروازے پر کھڑے ہو کر صدا لگا!"

اس کی آنکھوں کی چمک اور بھی بڑھ گئی۔ جیسے دہکتے کوئلوں پر سے پھونک کر خاک ہٹا دی گئی ہو۔ پھر بھی وہ عاجزی ہی سے بولا

"مجھے اتنے کا کام بھی تو کرنا ہے!"

بھکاری کی زبان پر کام کی لفظ! میں بھونچکا سا ہو گیا۔

"کیسا کام؟" میں نے گھبرا کر پوچھا

"جی، پانچ پیسے کے عوض کام!" اس نے کہا

"یہاں کوئی کام نہیں ہے!" میں نے ترشروئی سے جواب دیا۔

وہ اطمینان سے میری مسہری کے پاس فرش پر بیٹھ کر بولا "جی، آج آپ نے لمبا دورہ کیا ہے، آپ بہت تھک گئے ہوں گے۔ لائیے میں آپ کے پاؤں دبا دوں!"

.... اور اس نے میرے پاؤں دبانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

میرے دماغ میں اچکوں، چوروں، ڈاکوؤں کی ساری کہانیاں فلم کی بدلتی تصویروں کی طرح جلدی جلدی ایک کے بعد ایک آتی چلی گئیں۔ مجھے پنڈاریوں کی دوست بن کر گلے میں پھانسی لگانے اپھندا ڈالنے کی ساری حکایتیں یاد آ گئیں میں نے پھیلے ہوئے پاؤں کھینچ کر جلدی سے کہا۔

"نہیں، میرے پاؤں میں درد نہیں!"۔

وہ ایک سڑے ہوئے زخم کی طرح مسکرایا "ڈریئے نہیں بابو جی، میں کوئی چور اچکا نہیں!" پھر وہ سر اٹھا کر قدرے غرور سے بولا "میں ایک والی ریاست کا بھائی ہوں!"

ان تمام جذبات کے ردعمل کے طور پر جو اس وقت میرے دل میں طوفان سا اٹھائے ہوئے تھے میں بڑے زور سے ہنس پڑا۔ یہ صورت، یہ شکل، یہ پانچ پیسوں کا سوال اور والئ ریاست کے بھائی ہونے کا دعویٰ دونوں طرف آنکھوں سے آنسو نکلے۔ میرے ہاں تو قہقہے کی بےساختگی سے ہے، اس کے ہاں جھٹلائے جانے سے۔ رسوائی کے

تحقیر بڑی میری نظر دفعتہً اس کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس کی تکلیف کے احساس نے میرے قہقہے کی آواز کو اسی طرح روک دیا جس طرح پورے زور پر چالو کارخانہ سوئچ کے بند کرنے سے رُک جاتا ہے۔ مجھے اسی طرح کا ایک جھٹکا محسوس ہوا جس طرح تیز چلتے ہوئے موٹر کے سافر دونوں بریک لگانے پر محسوس کرتے ہیں۔

میں نے شرمندہ ہو کر کہا "میرا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ کی بات پر شک کرتا ہوں"۔

اس نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "نہیں، نہیں! آپ کی ہنسی بالکل بجا تھی۔ میری صورت شکل، میری حالت دیکھ کر ہر ایک کو ہنسی آتی ہی ہے۔ کوئی مجھے دیوانہ سمجھتا ہے، کوئی مجنوں، اور مجنوں تو سنگساری کا مستحق ہوتا ہی ہے۔ لیکن میں نے آج تک کسی کو نہ تو یہ بتایا کہ میں کون ہوں اور نہ کسی کو اپنی دُکھ بھری کہانی سنائی۔ ایک عجیب داستان ہے ۔۔۔۔۔"

اور اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالی اور اسے ہاتھ میں لیکر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے لب ولہجہ اور انداز گفتگو سے محسوس کیا کہ وہ ایک پڑھا لکھا شریف زادہ ضرور ہے۔ اور میں نے دل دہی کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں، میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ اچھا، آپ مجھے اپنی کہانی سنائیے ۔۔۔" اور میں اُٹھکر مسہری پر بیٹھ گیا۔

اس نے نظر جھکائے ہوئے کہا "جیسا میں نے عرض کیا میں ایک والئ ریاست کا بھائی ہوں۔ ریاست کا نام جان کر آپ کیا کریں گے۔ خاندان کی سبکی ہو گی۔ بس اتنا جان لیجئے کہ ریاست خود مختار ہے اور اس کا والی اپنے حدود کے اندر موت و زندگی کا اختیار رکھتا ہے۔ حکومت اس کی جنبش ابرو کے اشارے پر چلائی

جاتی ہے۔

گئے بسلامے بر غبد ۔۔۔۔ گئے بہ دشنامے خلعت دہد

سرکار حضور نے ہم لوگوں کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی تھی۔ عربی، فارسی، سنسکرت انگریزی، فرانسیسی و جرمنی ہی ہم نہ پڑھائے گئے بلکہ ہمیں نشانہ لگانا، سواری کرنا اور جملہ سپاہیانہ فنون بھی سکھائے گئے۔ بھائی حضور کو اسپورٹس کا زیادہ شوق تھا اور مجھے مطالعہ کا۔ میری فرمائش پر اسٹیٹ کی لائبریری میں ہزاروں ہزار نئی کتابوں کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ میرا خاص موضوع فلسفہ تھا۔ مابعد الطبعیات کی موشگافیوں میں مجھے خاص مزہ آتا تھا۔ اپنے استادوں میں سے کسی ایک سے فلسفیانہ سوالات پر بحث اور اس سلسلے میں بال کی کھال نکالنا میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ادبی بحثوں میں بھی شعروں اور نظموں کی انوکھی شرحیں اور مطلب بیان کرنے میں مجھے خاص لذت ملتی تھی مجھے زیبائش و آرائش، رقص و سرود، معشوق پری چہرہ و مے دو آتشہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے مہاتما بدھ کی زندگی اور اس کا فلسفہ بہت غور سے پڑھا تھا اور میں اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ میں نے ذہن و دماغ کی اس نیم پختگی کی حالت ہی میں طے کر لیا تھا کہ میں دوسرا بدھ بنکر رہوں گا۔ انھوں نے تو کچھ دنوں تاہل کی زندگی بسر کی۔ ایک شہزادی کے شوہر اور ایک بچے کے باپ بھی بنے رہیں وہ کبھی نہ کروں گا۔ میں عیسیٰ کی طرح عمر بھر بن بیاہا رہوں گا۔

اسی لئے جب سرکار حضور نے میری شادی کی بات چیت چھیڑی تو میں نے اُن کے پاس صاف صاف کہلا بھیجا کہ میرے متعلق وہ اس طرح کی فکریں دل سے

نکال دیں۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا اور نہ شادی کروں گا، ان کے لئے، جن کی کئی سو بیویاں تھیں، یہ پیغام بالکل انوکھا اور یہ بات بالکل عجیب تھی۔ ڈاکٹر، حکیم وید بھیجے گئے۔ سرکاری حکم تھا۔ معائنہ ہوا۔ سب نے بہ اتفاق فیصلہ کیا، کوئی بیماری نہیں۔ سرکار حضور کے ایک خرانٹ مہمان دیدہ مصاحب نے منجا ہوا پرانا نسخہ یاد دلا دیا۔ میرے سارے کاموں سے مرد ملازم ہٹا لئے گئے۔ ہر خدمت کے لئے کنیزیں مقرر کر دی گئیں۔ ایک سے ایک دل رُبا، ایک سے ایک شوخ و شریر ایک سے ایک تر یا چلتر کی ماہر۔ میں نے ان کے افعال و حرکات و جذبات کو ایک ماہر نفسیات کی طرح بغور مطالعہ کرنا شروع کر دیا محل، پریم آشرم کی جگہ جنسیات کے مطالعہ کی ایک تجربہ گاہ بن گیا۔ جب سرکار حضور کو مہینوں کی روزانہ رپورٹوں میں میرے رویّہ میں کوئی فرق نہ دکھائی دیا تو وہ بھی ہار کر بیٹھ گئے اور حکم جاری کر دیا گیا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ مجھ سے چھوٹے سب بھائی بہنوں کی شادیاں ہو گئیں اور میں ویسا ہی کنوارا رہ گیا۔

ایک دن صبح کے کوئی سات بجے تھے، میں باغیں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ روش کی دونوں جانب گلاب کھلے ہوئے تھے۔ سُرخ، زرد، سیاہ، سفید اور اُن پر ہندوستانی بلبلیں اور چھوٹی چھوٹی گل دار چڑیاں گا رہی تھیں۔ شہد کی مکھیاں اور کالے کالے بھونرے بھی اپنے اپنے طور پر ترانے گاتے طواف میں لگے تھے۔ میں دُور سے اس دلفریب منظر کو دیکھ رہا تھا اور غالب کے مطلع پر غور کر رہا تھا۔ ؎ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

میں سوچنے لگا کیا واقعی تناسخ صحیح ہے، کیا ہم اس دنیا میں برابر چولے بدل بدل کر آتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کیوں؟ پھر ہم فاعل مختار تو نہ ہوئے۔ ہم تو مجبور ہیں اور فوراً میر کا شعر یاد آ گیا۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا!

اگر اس طرح کی مجبوری ہے تو پھر نیک و بد، اچھائی برائی کا فرق کیوں؟ نہ برائی کی سزا، نہ نیکی کی جزا۔ کسے اچھا کہیں، کسے برا۔ کیونکر تمیز کریں۔ مشین جس طرح چلنے کے لئے بنائی گئی ہے اسی طرح تو چلے گی۔ اس سے اس کی امید کیوں ہو کہ وہ دوسری طرح چلے گی پھر آخر ہم پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں۔ مرتے ہی کیوں ہیں۔ ہمیں بار بار پیدا ہونے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی ہے! — دفعتہً دماغ اس طرف مڑ گیا کہ ہمارے سائنس داں بوس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانوں کی طرح نباتات میں بھی جان ہوتی ہے۔ وہ ہماری طرح خوشی بھی محسوس کرتے ہیں اور درد و تکلیف بھی۔ مگر جس تحقیق تک سائنس اتنی جستجو کے بعد اتنی دیر میں پہنچی شاعر کی تخیل نے اسے مدتوں پہلے محض معمولی مشاہدے کے ذریعہ معلوم کر لیا تھا۔ کیا بڑے شاعروں کو واقعی الہام ہوتا ہے۔ مگر کیا موجودہ سائنس کی نظر میں الہام بھی کوئی شے ہے؟

پھولوں کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا ہلکے ہلکے جھونکوں کے ساتھ مجھے چھوتی میرے بالوں کو بکھیرتی، میرے کپڑوں کو چھیڑتی گزرتی جاتی تھی اور میرے خیالات ایک جگہ کے بجائے نئی نئی پٹریاں بدلتے بھاگتے چلے جا رہے تھے، اور نہ حل ہونے والے سوالوں کا ایک انمول ہار گوندھتے جا رہے تھے

کہ دفعتہً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو بھائی صاحب، ولی عہد بہادر، اپنے مشکی پر سوار چلے آرہے ہیں اور اُن کے پیچھے پیچھے سائیس میرے عرب نقرہ کو لگام پکڑے لا رہا ہے۔

میں نے سلام کیا تو وہ بولے "ارے میاں راہب! تمہارا محل میں بیٹھے بیٹھے جی نہیں گھبراتا۔ آؤ چلیں، تفریح کر آئیں!"

مجھے گھوڑے کی سواری کا بیحد شوق تھا۔ اور تقریباً ایک مہینے سے میں نے محل کی چار دیواری کے باہر قدم نہ نکالا تھا۔ آج جو اپنا نقرہ دکھائی دیا تو بیساختہ جی چاہا کہ اچک کر اس کی پیٹھ پر فوراً بیٹھ جاؤں۔ مگر میں اس وقت صرف کرتا پائجامہ پہنے تھا۔ اپنے محل کے اندر تو اس لباس میں گھوم سکتا تھا۔ باہر اس طرح جانے کے خلاف احکام تھے۔ شہزادوں کے لئے ہر موقع و محل کی مناسبت سے لباس مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور پہننا ریاست کے والی کی توہین ہے۔ اسی لئے میں نے بھائی صاحب سے اجازت لیکر جلدی جلدی لباس بدلا اور میں اپنے عرب پر سوار ہو کر ان کے ساتھ محل سے نکل گیا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا برسات ختم ہو چکی تھی۔ زمین نے ہر جگہ اپنے سینے میں چھپے ہوئے لعل و جواہر سبزے اور ہریالی کی صورت میں اُگل دیے تھے ہوا میں بہت ہی دل پذیر خنکی تھی۔ درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ مشکی اور نقرہ، دلیر اور عرب سیاہی دسپیدی، اسٹریلیائی اور ایشیائی ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے فراٹے بھرتے چلے جا رہے تھے۔ دفعتہً شہر کے ختم ہونے کے آثار دکھائی دیے اور وہیں ایک میدان میں بنجاروں

کے خیمے نظر آئے۔ بھٹی پرانی چھوٹی چھولداریوں میں پورا پورا خاندان کہیں صرف کمبل اور چادر کا سائبان، کہیں گھنے درخت کے نیچے سینکوں کا ایک چھپر۔ انھیں میں کالے کالے، میل سے اٹے ہوئے بچے، لڑ رہے ہیں، کھیل رہے ہیں، رو رہے ہیں۔ عورتیں میلی بھٹی شلواریں اور پائجامے پہنے پیوند لگے شلوکوں اور کرتوں میں بمشکل نصف دھڑ چھپائے مختلف طرح کے کام کر رہی ہیں۔ کوئی پتیلیاں اور برتن مانجھ رہی ہے، کوئی چولھے میں آگ روشن کر رہی ہے، کوئی کھڑی دونوں ہاتھوں سے جوں بڑی بال کھجا رہی ہے۔ مرد یا تو بیٹھے حقہ پی رہے ہیں یا اپنے چھوٹے ٹٹو اور خچر مل رہے ہیں۔ مگر چھوٹے بڑے، عورت مرد ہر ایک چہرے پر افلاس کی گرد کی ایک تہ جمی ہے اور بے زری و جہالت کا تاریک ملمع چڑھا ہوا ہے — نہ جانے کیوں میرے منہ سے بیساختہ نذیر کا مصرعہ نکل گیا۔ ع

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ!

مگر بھائی صاحب نے جو چیز سب سے زیادہ محسوس کی وہ منظر کی گندگی تھی۔

وہ بولے، "جلدی نکل چلو، یہ ٹھہرنے کی جا نہیں!"

اور ہم نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی۔ اور بنجاروں کے خیموں اور چہروں پر گرد کی ایک اور تہ چڑھا دی۔

سامنے ریاست کی مشہور جھیل رام ساگر تھی۔ اس کو سو سال لمبی جھیل پر سرکار حضور نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے اسے ایک قابل دید چیز بنا دیا تھا۔ اس میں زنانے مردانے گھاٹ ہیں۔ سنگ سرخ اور سنگ موسیٰ کے کنارے ہیں، جنگل

میں بہنے والے چشموں کے مناظر ہیں، پہاڑوں پر بل کھاتی ہوئی ندیوں اور ان کے آبشاروں کے سماں ہیں، اور کناروں پر سنگ مرمر کی بنی ہوئی کشتی گاہیں ہیں۔ اس میں پیرنے کے وہ تمام سامان موجود ہیں جو اس ورزش کا جانوں کو حریص بنا سکتی ہیں۔ اس پر لطف یہ کہ اس کا پانی صاف ہے، میٹھا ہے اور اس میں کسی قسم کی گندگی کی آمیزش قانونی جرم ہے۔

ہم جھیل کی اس عمارت کی طرف بڑھے جو شاہی خاندان کے غسل کے لئے مخصوص تھی۔ اور جہاں کسی دوسرے کو نہانے کی اجازت نہ تھی۔ اور ہم نے دیکھا ..... ہم نے دیکھا ....."

اور بھکاری شہزادے نے جھپٹ کر میرے سرہانے سے سگریٹ اٹھا لی اور مجھ سے بغیر اجازت لئے اس نے جلدی سے ایک سگریٹ جلائی اور کئی لمبے لمبے کش کھینچے۔ پینے کا انداز بتاتا تھا کہ اسے یہ دنیاوی من وسلویٰ مدتوں کے بعد ملا ہے۔ لیکن وہ اس سے لذت یاب ہونے کی جگہ دوا کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے اپنے جذبات پر قابو پاکر اور اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کر کے وہ اپنی کہانی بیان کرے۔ اس نے آدھی جلی ہوئی سگریٹ زمین پر رگڑ کر بجھا دی۔ اور بچے ہوئے ٹکڑے کو کان کے پیچھے کھونس لیا۔ پھر وہ میرے چہرے کو دیکھ کر جھجکا۔ کچھ شرمایا اور ٹکڑا کان کے پیچھے سے نکال کر اسے چٹکیوں سے ملتے ہوئے بولا:

"وہ شہزادیوں کے گھاٹ پہ مادرزاد ننگی کھڑی تھی۔ اس کے گورے رنگ پر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں کندنی ملمع چڑھا رہی تھیں، اس کے لمبے کالے بال ہوا میں اڑتے اور لہراتے سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے۔

وہ خود پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنی کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ ایک چمکتے ہوئے جگنو کی طرح اس کا چہرہ دفعتہً دمکا، اک چھپاکے کی آواز آئی اور وہ پانی میں غوطہ لگا گئی۔ میں بیساختہ گھوڑے سے کود کر ادھر لپکا۔ مجھے نہ ولی عہد بہادر کا دھیان تھا، نہ اپنی شہزادگی کا۔ نہ ماحول کا خیال تھا اور نہ یہ یاد تھا کہ میں کون ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے عمر میں آج پہلی دفعہ جل پری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور اگر میں نے جلدی نہ کی تو وہ شاید ہمیشہ کے لئے نظروں سے غائب ہو جائے گی۔ دل یہی کہہ رہا تھا کہ اس عجوبۂ روزگار کو اگر دوبارہ دیکھنا ہے تو جلدی کرو!۔

بھائی حضور مجھے آوازیں دے رہے تھے۔ کیا کر رہے ہو، کہاں جا رہے ہو، میں نے کچھ نہ سنا۔ میں نے کچھ نہ کہا، میں دوڑ کر جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ میں نے جھک کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ پانی کی سطح سے بالوں میں چھپا ہوا چودھویں کا چاند نکلا، ایسپراگس جیسے نازک اور سفید ہاتھوں نے بالوں کو جھٹک کر چہرے سے ہٹایا اور ایک آن واحد کے لئے دو سحر آنکھوں سے میری آنکھیں لڑیں۔ اور اس نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ پھر غوطہ لگا لیا۔

بھائی حضور نے اتنی دیر میں شکارستان کی نگراں ملاحنوں کو آواز دے دی۔ وہ دوڑتی ہوئی ساحل تک پہنچیں اور ان کے حکم کا انتظار کرنے لگیں۔ انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکانے کی کوشش کی۔ میں نے ان کو گھبرا کر دیکھا اور میرے منہ سے بیساختہ نکلا: "جل پری!"

بھائی حضور ہنس دیئے۔ "ابھی آگئی ہے تمہاری جل پری!" اور انھوں نے

ملاحتوں کو اشارہ کر دیا۔ اور اُن میں سے دو جھیل میں چھلانگ پڑیں۔ معلوم ہوا دو مگرمچھ ایک رو ہو کا تعاقب کرنے لگے۔

بھائی حضور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں لائے جہاں ہمارے گھوڑے کھڑے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے خود کے ٹانگیں نہیں ہیں، میں بالکل بھائی حضور کے سہارے چل رہا ہوں۔ مجھ سے قوت عمل بالکل سلب کر لی گئی ہے یا رہ رہ کے کانپتا تھا، جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھتے دیکھتے جاگ پڑا ہوں، میری مٹھیاں بار بار کھلتی اور بند ہوتی تھیں اور مجھے بار بار محسوس ہوتا تھا جیسے میرے دل و دماغ میں مختلف طرح کی چنگاریاں جلتی اور بجھتی ہیں۔ میں نے گھبرا کر اپنے عرب گھوڑے کی زین سے ٹیک لگائی اور کانپتے ہاتھوں سے کھڑے کھڑے سگریٹ جلائی، جلدی، جلدی دو تین لمبے لمبے کش لگائے۔ جب جا کر میری یہ کیفیت کم ہوئی۔ ملاحتیں اسے پکڑ کر لے آئیں۔ بھیگے جسم پر سیاہ خشک ساری، کمر سے نیچے بالوں سے پانی ٹپکتا ہوا، چھوٹے نازک پاؤں گیلا نقش قدم بناتے ہوئے۔ ان دونوں کالی ملاحتوں کے درمیان ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے مشک کے دو ناؤں کے درمیان کافور کی ایک ڈلی، جیسے دو آبنوسی مجسموں کے درمیان ایک شمع فروزاں جیسے بدلی سے دھکی کالی رات کا سینا چیرتی ہوئی چمکتی بجلی!

میں تو آنکھیں بند کر کے جھومنے لگا مگر بھائی حضور نے کڑک کر پوچھا

"کون ہے رے تو؟"

اس نے بڑی نڈری سے جواب دیا "شہزادی!"

وہ مسکرا دیے "اچھا جب ہی آپ شہزادیوں کے گھاٹ پر نہا رہی تھیں!"

ملاحوں میں سے ایک، گھاٹ کی اچھی طرح نگرانی نہ کرنے کے الزام سے بچنے کے لئے جلدی سے بولی "سرکار یہ النجادی بنجارن ہے۔ بڑی نٹ کھٹ ہے پاجی۔ نہ جانے کیسے گھس آئی سرکاری گھاٹ میں!......"

بھائی حضور نے حکم دیا "اچھا اسے بند رکھو۔ شام کے دربار میں پیش کرنا"

اتنی دیر میں کئی سرکاری ملاح بھی آ گئے تھے سب نے سلام کیا اور جھنجھتی تڑپتی شہزادی کو وہ کشاں کشاں گھاٹ کی عمارت کی طرف لیکر چلے گئے۔ میں خاموش تھا۔ بھائی حضور ولی عہد تھے۔ سرکار حضور کے بعد انھیں کا ساری ریاست میں حکم چلتا تھا۔ میں اگر کچھ کہتا تو نہ جانے ملاح اور ملاحنیں مانتے بھی یا نہیں لیکن میرے دل میں پنکھے لگے تھے۔ حلق میں کانٹے پڑے تھے اور منہ کا ذائقہ کڑوا ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کئی دن سے بخار کا مریض ہوں۔

بھائی حضور نے گھوڑے پر بیٹھ کر ہنستے ہوئے کہا "تو تمہاری جل پری تو جار ٹکے کی بنجارن نکلی!"

معلوم ہوا جیسے انھوں نے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ پھر بھی میں ان سے بدتمیزی نہ کر سکتا تھا۔ بڑے بھائی تھے اور ولی عہد میں نے اپنے صحیح جذبے کو چھپاتے ہوئے کہا "آپ بھی بھائی حضور بعض وقت بڑے بے رحم ہو جاتے ہیں۔ غریب کو ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا ہوتا دربار میں پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

انھوں نے مجھکو بغور دیکھا۔ سر ہلا کر کہا "میاں شاہی گھاٹ پر نہانے کا جرم چھوٹا نہیں۔ اس کی سزا سات برس کی قید سے لیکر موت تک ہے۔ اس لئے سرکار ہی فیصلہ فرمائیں گے۔"

میں نے کہا" مگر۔ مگر۔۔۔۔۔"

ان کے چہرے پر دفعتہً وہی سختی اور بے رحمی جھلکنے لگی جو مطلق العنان امیروں راجاؤں، بادشاہوں کے چہروں پر نادری حکم صادر کرتے وقت دکھائی دیتی ہے۔ وہی جو ان کو انسان کی جگہ خونخوار درندوں سے مشابہ بنا دیتی ہے۔ "حکومت بچوں کا کھیل نہیں!" وہ غرائے اور اپنے مشکی کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گئے۔ میرا فقرہ خود بخود ساتھ ہو لیا۔ جیسے وہ مشکی کے قدم بقدم چلنے ہی میں اس وقت اپنی بھلائی سمجھتا تھا۔

محل میں واپسی پر میں اپنے بستر پر جا گرا۔ دو کنیزیں میرے جوتے موزے اتارنے دوڑیں تو میں نے جھٹک دیا۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو میں نے ان میں سے ایک کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ اس کا سن چودہ پندرہ برس تھا اور وہ سب میں حسین تھی۔ وہ اس وقت کچھ سہمی سہمی، گھبرائی گھبرائی سی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی — جی چاہتا تھا اسے لباس اتروا کر دیکھوں کہ کیا اس کے اِن بھی وہی تناسب اعضا ہے جو شہزادی کے نیم عریاں لباس سے جھلکتا تھا۔ مگر میں اس سے یہ کہوں کیسے سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا سمجھے گی اپنے دل میں — پھر بھی دل نہ مانا۔ میں نے اسے اور قریب بلایا۔ وہ آئی مگر ڈرتی ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے اچانک التفات سے خوفزدہ ہے۔ میں نے کہا "ڈرو نہیں، میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں" میرے لب و لہجے سے وہ ذرا مطمئن ہوئی۔ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

میں نے پوچھا۔ "تمھیں میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہے؟"

اس نے سر جھکا کر آنچل کو انگلی میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ "آپ کی خدمت کے لئے"
"کس طرح کی خدمت؟" میں نے ہونٹوں پر زبان پھرا کر پوچھا
اس نے سر ہلاتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ کر کہا "ہر طرح کی خدمت!"
میں نے خشک حلق سے بلغم اتار کر کہا "میرے سامنے ننگی ہو کر ناچو گی؟"
وہ ذرا سا پیچھے کھسکی، پھر اس نے گھٹی آواز میں کہا "لونڈی ہوں، جو حکم ہو گا بجا لاؤں گی۔"

لونڈی کے لفظ نے میرے سارے "موڈ" کو بدل دیا۔ میں غصے سے بھڑک اٹھا۔ میں نے جھڑک کر کہا "نہیں چاہیے مجھے لونڈی باندی! پیسوں سے خریدا ہوا جسم! چلی جاؤ میرے سامنے سے، دور ہو جاؤ!"

ایک پٹے ہوئے کتے کی طرح وہ کمرے سے چلی گئی۔

میں پلنگ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ دونوں تصویریں بار بار میری آنکھوں میں ابھرتی تھیں۔ بوڑھا لنگڑی جل پری اور ملاحنوں کے درمیان گلاب کی کلی۔ مجھ سے عاقبت اندیشی کی صلاحیت دفعتہً سلب ہو گئی۔ میں جھپٹتا ہوا کمرے سے باہر نکلا پھر "شیر دل" نقرہ پر بیٹھا اور اسے سرپٹ بھگاتا ہوا جھیل کے کنارے شہزادی کے گھاٹ پہنچا۔ ملاحنیں اب کے باقاعدہ پہرا دیتی ہوئی ملیں۔ انھوں نے شہزادی کو ایک کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ وہ اس کے دروازے پیٹ پیٹ کر انھیں کوس رہی تھی۔

میں دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوا تو اس کی ساری کا آنچل کمر میں لپٹا تھا اس کے بال کمر تک بکھرے تھے، اس کی آنکھیں غصہ سے سرخ اور اس کے گال

بالکل لال ہو رہے تھے۔ یہ تیسری تصویر پہلی دو تصویروں سے بھی زیادہ دلربا تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں پڑے ہوئے پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ مجھے تعجب سے دیکھنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ میرے تمتماتے ہوئے چہرے اور کپکپاتے جسم کو دیکھ کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"آپ چھوٹے شہزادے ہیں" اس نے سرگوشی کے انداز سے پوچھا۔

میں نے سر ہلا کر ہامی بھری۔ اور مجھے دفعتہً یہ یاد آ گیا کہ میں شہزادہ ہوں۔ میں ایک سرکاری مجرم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ حضورِ عالی کے احکام بڑے سخت ہیں ممکن ہے کہ یہ بن کھلی کلی ہی نہ ہمیشہ کے لئے مرجھا جائے بلکہ مجھے کبھی نظر بندی اور قید تنہائی کی سزا بھگتنا پڑے۔ مجھے اپنی ٹانگوں میں کمزوری سی محسوس ہوئی اور میں بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شہزادی میرے قریب کھسک آئی۔ میں کانپنے لگا۔ وہ مسکرائی، اس نے میرے کندھے سے سر لگا لیا۔ وہ لجاجت سے بولی "میرے شہزادے مجھے چھوڑ دیجئے!"

میں سرکارِ حضور کی خفگی کے خیال ہی سے کانپ اٹھا۔ اس شریر نے پلنگ سے اتر کر جلدی سے میرے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ وہ بولی "میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دیجئے"

میں نے بڑی مایوسی سے کہا "میں بے بس ہوں شہزادی، مجھے چھوڑنے کا کوئی اختیار نہیں!"

وہ طنز سے ہنسی۔ "ہونہہ! شہزادے ہیں اور ایک مجرم کو بھی نہیں چھوڑ سکتے!"

میں نے کہا "اگر میں چھوڑ بھی دوں تو تمہیں پھر پکڑ لیں گے۔ شام کے دربار میں

حاضری ضروری ہے۔"

وہ بولی "ہونہہ! بس اس گھاٹ سے نکل جانے دیجئے، پھر دیکھوں گی کون پکڑ لیتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا تو جاؤ، بھاگ جاؤ، مگر پھر ملاقات؟ ..... اور میں آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

اس نے جھک کر میرے پاؤں چھو لئے۔ "میں ملنے آؤں گی میرے شہزادے!" اور وہ بجلی کی سرعت سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ملاحوں نے روکنا چاہا میں نے دروازے پر سے ڈانٹا "جانے دو!"۔ اور وہ تیر بھاگتی ہوئی ادھر نکل گئی جدھر بنجاروں کا ڈیرا تھا۔

بھکاری نے ٹھنڈی لمبی سانس لی۔ میں نے اپ کے خود ہی سگریٹ کیس بڑھا دیا۔ اس نے کہا "شکریہ" اور وہ سگریٹ جلا کر کش لیتا ہوا بولا۔ "شام کے دربار میں وہ تو نہیں پیش ہوئی۔ لیکن سارے بنجارے رسیوں میں جکڑے حاضر کیے گئے۔ لیکن خود سرکار حضور کے بار بار پوچھنے پر بھی کسی نے یہ نہ بتایا کہ وہ کہاں گئی۔ دھمکیاں دی گئیں، کوڑے لگائے گئے لیکن کوئی بھی اس کے سوا نہ پھوٹا کہ وہ بھاگ گئی۔ مجھ پر بھی شاہی عتاب نازل ہوا، قانون شکنی کیوں کی گئی۔ شاہی مجرم کو فرار میں کیوں مدد دیگئی۔ میں خاموش سر جھکائے سب سنتا رہا۔ سرکار حضور نے ڈانٹا۔ بھائی حضور نے مذاق اڑایا۔ وزیروں نے نصیحت کی، مگر میرا سکوت نہ ٹوٹا۔ بالآخر سرکار حضور نے جھلا کر مجھے ایک مہینہ اپنے محل میں بند رہنے کا حکم سنا دیا۔ میں اسی طرح چپ سادھے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور پلنگ پر لیٹ کر اس پر غور کرنے لگا

کہ آخر میری شہزادی کہاں گئی اور میں اسے پھر کہاں پاؤں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی الجھن تھی کہ میں اس بنجارن کے پیچھے کیوں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ اتنے بڑے راجہ کا بیٹا اور نیچ ذات کی عورت سے عشق۔ لوگ کیا کہیں گے۔ بھائی حضور نے تو آج بھرے دربار میں خوب خوب چٹکیاں لیں۔ کل سارا ملک مجھ پر تھوکے گا۔ سرکار حضور کے غصہ کا پارہ کس ڈگری پر پہنچے گا۔ سرکار عالیہ کے سامنے اگر پیش کیا گیا تو میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ وہ ماں ہونے پر بھی میرا قصور معاف نہ کریں گی۔ مگر میں کیا کروں۔ اس شہزادی نے تو جیتے جی میری ساری دنیا ہی پلٹ دی ہے۔ رہ رہ کر جی چاہتا ہے، محل سے نکل چلو، سب کو چھوڑ دو، نام، دولت، عزت سب پر لات مارو اور اس کی تلاش میں نکل پڑو۔ اسی کو حاصل کرو۔ جس طرح ہو اسے ڈھونڈ کر اس کی گود میں سر رکھ دو۔

میں نے سوچا کیا اسی کو عشق کہتے ہیں۔ کیا یہ وہی پریم ہے جس کے گن گائے جاتے ہیں۔ جس کی تعریف میں دنیا کا ہر شاعر ادیب اور آرٹسٹ رطب اللسان ہے۔ مگر محض ایک بار کسی کو دیکھ لینے یا اس سے گفتگو کر لینے سے یہ کیفیت کیوں؟ میں نے غور کیا اس جذبے میں اور ہوا و ہوس میں کیا فرق ہے۔ ابھی تو یہی خواہش ہے کہ شہزادی آنکھوں کے سامنے رہے، چہلیں کرتی رہے، خوش ہوتی رہے، چھیڑتی رہے، مگر آگے بڑھ کر، جسم کی پکار؟ جنسی بھوک؟ لیکن اگر اس کے ہاں یہ کیفیت نہ ہوئی؟ اس کا اپنا کوئی بنجارہ ہوا؟ بس یہ خیال آتے ہی محسوس ہوا جسم بھر میں کسی نے ایک بار سیکڑوں سوئیاں چبھو دیں! میں تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں۔ وہ میرے ساتھ میری ہو کر رہے گی، میں سب کچھ

کھو کر اسے جیت لوں گا! میرے جیتے جی وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی! نہیں ہو سکتی!..

میں نے ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتا رہا، ٹہلتا رہا۔ پورے کمرے کی سیکڑوں بار پیمائش کر ڈالی، فرش کچل ڈالا، لیکن الجھن بڑھتی ہی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا بات ہے کہ کبھی سارے جسم میں چنگاریاں سی جل اٹھتی ہیں کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہر بُن مو میں برف رکھ دی گئی ہے۔ دو پہر والی باندی کئی بار آ کر جھانک گئی۔ اس کو دن کی گفتگو سے کچھ امیدیں پیدا ہو چلی تھیں، ایک بار تو ہمت کر کے پاس تک چلی آئی۔ مجھے ہمہ سپردگی کے انداز سے دیکھ کر پوچھا "میں ناچ کر دل بہلاؤں؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ نہ جانے کیسے کیسے ارمان، کیسی کیسی تمنائیں اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھیں، لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے وہ شہزادی کی چیز پر ڈاکا ڈالنا چاہتی ہے۔ میں نے جھڑک دیا۔ "دور ہو جاؤ!" وہ سراسیمہ بھاگی۔ در وازے سے نکلتے ہوئے اس کا دوپٹہ سر سے گر گیا۔ اسے پلٹ کر اٹھانے کی اس کو جرأت نہ ہوئی۔ میں نے ڈانٹا "دوپٹہ اٹھا لے جا۔" وہ ڈرتی ڈرتی پلٹی تو دونوں ہاتھوں سے چھاتی چھپائے ہوئے۔ مجھکو یہ انداز بہت پسند آیا۔ میں مسکرا دیا۔ لیکن نہ جانے یہ مسکراہٹ بھی کتنی ڈراؤنی تھی کہ وہ سسکتی ہوئی دوپٹے پر جھکی اور اسے ہاتھ میں لیتے ہی بے تحاشا بھاگ گئی۔

میں کمرے سے باہر آ کر روش پر ٹہلنے لگا۔ مختلف طرح کے ہندوستانی اور انگریزی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہوا ان کی خوشبو سے معطر تھی۔ محل کے برآمدے کی روشنی میں اب بھی بھونرے اور مکھیاں اڑتی اور ان کے گال چومتی، ان کا رس، رنگ اور روپ چوستی دکھائی دیتی تھیں، مگر مجھے کسی کی کوئی بات بھلی نہ لگتی

تھی۔ میرے دماغ میں تو لمبی لمبی لوہے کی کیلیں ٹھونکی جا رہی تھیں! کھٹ! کھٹ!...

اور بھکاری شہزادے نے اپنی سوکھی سوکھی انگلیاں اپنی کھوپڑی پر اس طرح ماریں جیسے واقعی کوئی ہتھوڑی سے کیلیں ٹھونک رہا ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ قصہ بیان کرتے کرتے اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی اور کہانی کی ابتدا میں جو جذبہ ہمدردی و رحم مجھ میں پیدا ہوا تھا اس پر ایک ہلکی گھبراہٹ، ایک مبہم خوف غالب آتا جا رہا تھا۔ رات کا سناٹا، بھیانک تاریکی، دور تک ہمارے سوا کسی دوسرے انسان کا موجود نہ ہونا۔ اس ہڈیوں کے ڈھانچے کا قصہ کے بیان کرنے کا طرز اور اس کی حرکات کا ڈرامائی انداز، ان تمام باتوں نے مل جل کر تحت الشعور میں دبا ہوا پچھلا ڈر پھر سے ابھارنا شروع کیا۔ اس خوف کا باعث قصہ کا موضوع نہ تھا۔ وہ تو کافی شیریں، دلچسپ اور دل پذیر تھا۔ اس کا اصلی سبب بنگلے کا پورا ماحول تھا، اور قصہ گو کا انداز اور اس کا حلیہ۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ خواب ہے کہ حقیقت!

یہی وجہ تھی کہ میں نے قصہ کو تاہ کرنے کے لئے سوال کر دیا۔ "تو شہزادی اور آپ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی؟"

وہ بولا۔ "نہ ہوتی تو آج یہ گت کیوں بنتی؟ اسی رات میں ہوئی۔ تقریباً بارہ بجے جب میں اپنے کمرے میں مسہری پر پڑا نیند بلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ میں نے خیال کیا نگاہ کا دھوکا ہے۔ عاشق کو ہر شے میں محبوب کی صورت نظر آنے لگتی ہے۔ میں نے آنکھیں مل ڈالیں۔ اب جو دیکھا تو وہ کمرے کے باہر نہیں اندر ہے۔ کوندے جیسی لپک پر میں گھبرا گیا۔ خوشی اور تعجب نے مجھے

بوکھلا دیا۔ میں نے کہا "تم! تم؟ ارے یہاں کیسے؟"

وہ خراماں خراماں میرے پاس آئی۔ میرے سر کے بالوں میں انگلیاں دوڑا کر بولی "میں نے وعدہ کیا تھا شہزادے!"

میں اپنے رہبانی ارادے بھول گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے گود میں سمیٹنا چاہا۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر مجھے چمٹنے سے روکا۔

وہ بولی "میں اس طرح نہیں مل سکتی، میرے شہزادے!"

میں نے کہا "پھر کیوں آئیں؟"

وہ بولی "مجھے اب بھی تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے ایک تیز اور مضبوط گھوڑا چاہیئے تاکہ میں آج رات ہی میں ریاست کے حدود سے نکل جاؤں"

میں نے بے لبسی سے پوچھا "اور میں؟"

وہ بولی "تم شہزادے ہو، ہم بنجاروں کو بیوی نہیں بنا سکتے"

میں نے والہانہ انداز سے کہا "مگر میں بغیر تمہارے زندہ نہیں رہ سکتا"

اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "تو آؤ چلو، مگر تمھیں بھی بنجارہ بننا پڑے گا"

میں نے کہا "منظور!"

اس نے محل کے ساز و سامان کی طرف اشارہ کر کے کہا "اور یہ سب؟"

"تم پر سے قربان!"

——— اور اس نے مسکرا کر میرے سینے سے اپنا سر لگا دیا۔

ہم اسی شب اپنے نقرہ اور بھائی حضور کے مشکی پر سوار ہو کر ریاست کی

سرحد پار کر گئے۔ اور میں پورے ایک سال تک بنجاروں کی زندگی بسر کرتا رہا۔ ہمارے سر پر کبھی ایک کمل کا سائبان ہوتا کبھی وہ بھی نہیں۔ کبھی ہم سبزہ زاروں میں لیٹتے کبھی پتھر کی چٹانوں پر، کبھی ہمارا بستر ٹھنڈا بالو ہوتا، کبھی کسی چھتنار درخت کی موٹی سی شاخ، مگر ہمارا ہر لمحہ جنتی ہوتا۔ شہزادی کے ہر فعل میں ایک خاص کیف ہوتا، ہوش ربا دلفریب، فرحت انگیز، اور مرا جی چاہتا میں بس اسے دیکھے جاؤں، چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے۔ اور وہ مجھے جی بھر کر دیکھنے دیتی مگر میرا دل سیر نہ ہوتا طبیعت نہ بھرتی۔ میں کبھی کبھی سوچتا کیا جنت میں اس سے بھی زیادہ خوشی ممکن ہے۔ کیا فردوس میں بابا آدم کو اس سے بھی زیادہ مسرت حاصل ہوتی تھی — کہ دفعتہً ہماری جنت میں بھی ایک دن سانپ گھس ہی آیا!

میری مفروری اور گم شدگی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اشتہارات دیئے گئے تھے۔ حلیہ شائع کیا گیا تھا، انعامات کا اعلان ہوا تھا، آدمی تلاش کے لئے چھوڑے گئے تھے۔ ان میں سے ایک جاسوسی کرتا، بنجاروں کے ہر قافلے کو دیکھتا، ٹوہ لیتا ہم تک پہنچ ہی گیا۔ وہ مجھ سے ملا۔ سرکار عالی کی بیماری کی خبر سنائی۔ سرکار عالیہ کے بستر مرگ پر ہونے کی اطلاع دی۔ کہنے لگا فرماتی ہیں "بس اپنے بچے کو دیکھنے کو روح اٹکی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لوں ایک بار پھر چھاتی سے اپنے لعل کو لگا لوں تو اطمینان سے اس دنیا سے اُٹھ جاؤں"۔ مگر میں ان مکاروں کو، بات بنانے والوں کو خوب جانتا تھا۔ میں نے کہہ دیا "ان کا بیٹا ان سے پہلے مر چکا۔ میں تو شہزادی کا عاشق ہوں، اس کا شوہر ہوں، بنجارن کا مرد۔ میرے لئے اب اس دنیا میں اس کے سوا کوئی نہیں"۔ وہ مایوس ہو کر اس وقت تو چلا گیا۔ لیکن رات میں جب ہم ایک دوسرے

کے گلے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے دس بارہ آدمیوں نے ہمیں اچانک گھیر لیا اور شہزادی کو باندھ کر ایک قفس میں ڈال دیا۔ مجھ سے کہا "گھوڑا حاضر ہے، جی چاہے تو ساتھ چلئے ورنہ ہم اپنی مجرمہ کو لئے جاتے ہیں۔"

چارہ کار ہی کیا تھا، میرا ریوالور انھوں نے پہلے ہی قبضہ میں کر لیا تھا، بنجاری بندوقوں میں گھرے کھڑے تھے۔ میں مجبوراً ان کے ساتھ ہو لیا۔ ہم تین دن تین راتیں سفر کر کے دربار میں حاضر کیے گئے۔

سرکار عالی نے منہ پھیر کر حکم دیا۔ "اس پاجی عورت کو سپاہیوں میں سے کسی ایک کو دیدو کہ اپنا جی بہلائے اور صاحبزادے کو غسل کرا کے کپڑے بدلوا کے میرے سامنے پھر حاضر کرو۔"

میں اس ذلت و رسوائی کو برداشت نہ کر سکا۔ میں نے بھرے دربار میں کہہ دیا کہ "شہزادی میری بیوی ہے، میری ناموس! اگر کسی سپاہی نے اسے ہاتھ لگایا تو میں اس کی بوٹیاں کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلاؤں گا!" میرے اس جواب نے ان کا غصہ اور بھڑکا دیا انھوں نے حکم دیا "ان دونوں کو قید خانے میں بند کر دو۔ مگر ایک جگہ نہیں، الگ الگ کمروں میں!"

ہم دونوں قید کر دیے گئے۔ قلعہ کے تہ خانے کے ایسے کمروں میں بند کیے گئے جیسے موٹے موٹے چوہوں نے اپنی تفریح گاہ بنا رکھا تھا گہری تاریکی میں ان کی آنکھیں چمکتی تھیں، وہ بار بار ایک دوسرے کو کھدیڑتے، لڑتے اور کانوں کو تکلیف دینے والی آوازیں نکالتے تھے۔ کمرے میں کوئی روشن دان نہ تھا، سیلن حد سے زیادہ تھی اور وہ سڑاہن، وہ بُو کہ بار بار جی متلاتا تھا۔ لیکن اولادِ آدم بڑی

سخت جان ہے۔ وہ سب کچھ جھیل جاتی ہے۔ رات کٹ گئی صبح ہوتے ہی ہمارے لئے بھی دوسرا دن تھا۔ ہمیں قید تنہائی کی سزا دینے والے سرکار عالی کے لئے رات ہی میں ہر روشن دن تاریک ہو چکا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ رات کو جب مجھ پر غصّے کا غم دل میں چھپائے اندر پہنچے تو سرکار عالیہ سے نوک جھونک کی باتیں رہیں۔ سرکار عالی پر قلبی دورہ پڑا اور وہ اپنے سے بھی زیادہ سخت مگر عادل جج کی عدالت میں پیش ہونے کے لئے طلب کر لئے گئے۔ آٹھ بجے دن کو جب میں قیدیوں کا لباس پہنے اپنی تاریک کوٹھری میں بیٹھا تھا یہ خبر ملی۔ میں سچ کہتا ہوں مجھے اس حادثے پر کسی قسم کا رنج نہ ہوا۔ حال کی سخت گیری نے میرے لئے ماضی کی ساری عنایتوں کو قابل فراموش بنا دیا تھا۔ میں نچلی شام سے انھیں باپ کی جگہ اپنا اور اپنی شہزادی کا دشمن تصور کرنے لگا تھا۔ اس لئے نہ میں نے اظہار افسوس کیا اور نہ میں نے آنسو بہائے۔ ہاں اس کی خوشی ضرور تھی کہ بھائی حضور کو سخت سزا۔ وہ نسبتہً رحم دل تھے۔ ان کو میرے ساتھ ہمدردی تھی۔ وہ یہ نہ بھول سکتے تھے کہ ہم دونوں ایک ساتھ کھیلے، بڑھے اور پڑھے ہیں۔ وہ لاکھ خفا ہوں پھر بھی میں ان کا بھائی، ان کا قوت بازو ہوں۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں میرے خیال کی تائید ہوئی۔ وزیر اعظم خود میری رہائی کا پروانہ لیکر آئے۔ میں نے کہا میں بغیر شہزادی کے نہ جاؤں گا۔ اس کے لئے بھی معافی کا حکم آیا اور ہم دونوں بند موٹر میں بٹھا کر محل میں پہنچا دیئے گئے۔

میں نے اپنے محل میں جا کر نہا دھو کر کپڑے بدلے اور شہزادی کے بارے میں خواصوں کو ہدایت دے کر میں بھائی حضور کی خدمت میں نذر پیش کرنے حاضر ہوا۔

انھوں نے گلے لگا یا، دل دہی کی اور سرکار عالی کے دفن کفن کے سارے فرائض مجھے سپرد کئے۔ میں نے انھیں بخیر و خوبی انجام دیا اور میں باطمینان اپنے محل میں رہنے لگا۔

شہزادی کے لئے سارے ممکن آرام مہیا تھے۔ ماما دائیاں، خواصیں، کنیزیں ہر وقت خدمت میں لگی رہتی تھیں۔ میں اب بھی بھونرے کی طرح اس کے گرد پھرتا تھا۔ اس کے لئے نئے نئے گھوڑے نئی نئی موٹریں خریدتا تھا، اسے اطلس و حریر زربفت و کمخواب پہناتا تھا اور لعل و گہر، الماس و زمرد اس کی گود میں برساتا تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ پچھلی سی شہزادی نہ رہی۔ محل میں رہنے کا اس پر وہی اثر ہوا جو ایک نو گرفتار چڑیا پر سونے کے پنجرے میں بند کر دیئے جانے کا ہوتا ہے۔ اس کے شہابی رنگ پر طلائی رنگ غالب آنے لگا۔ اس کی سیماب بیت سخت جمی ہوئی برف میں تبدیل ہو گئی خوشی کے چمن میں فکر کے کانٹے نکل آئے میں سوچنے لگا شہزادی کو پچھلی معصوم مسرت کیسے واپس لائی جائے۔ مگر اس نے مجھے زیادہ غور و فکر کا موقع نہ دیا۔

ایک شب جب میں بارہ بجے کے بعد بھائی حضور کے دربار سے پلٹا تو میں نے محل کو شہزادی سے خالی پایا۔ باندیوں سے پوچھا، ملازموں سے دریافت کیا، گھر کا کونا کونا تلاش کیا مگر وہ کہیں نہ ملی۔ جب کمرے میں پلٹ کر بستر پر گر پڑا اور تکیہ کھینچ کر سر کے نیچے لانا چاہا تو وہاں ایک پرزہ رکھا ہوا دکھائی دیا۔ لکھا تھا۔

"میرے شہزادے! میں جانتی ہوں۔ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے مگر آزادی کی زندگی سے، تم سے بھی زیادہ!"

میں نے اسی شب میں پہلی دفعہ شراب پی اور اتنی پی کہ میں بیہوش ہو کر گر پڑا صُبح کی اعضا شکنی اور دردِ سر نے مجھے پہلی دفعہ اپنی ظاہری حالت کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے دیکھا میرے کرتے کے گلے کے سارے بٹن کھلے ہوئے ہیں۔ دامن اور آستین پر بدبو دار دھبے ہیں اور کمرے کی ہر چیز بے ترتیبی سے پڑی ہے۔ مجھے یاد آگیا میں نے شب میں شراب پی اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری شرمندگی اور خجالت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مُنہ کا ذائقہ ایسا تھا جیسے کہ میں نے رات بھر خاک پھانکی ہے۔ کچھ ترش کچھ کڑوا، کچھ پھیکا۔ حلق میں کانٹے سے پڑے تھے، بار بار چکر سا آرہا تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور حمام میں گھس گیا۔ اور میں نے اپنے محل میں پہلے دن آبدار خانے کی سربمہر صراحی کی جگہ پائپ کا پانی چلو لگا کر پیا۔ پھر جلدی جلدی کپڑے اتار کر نیم گرم پانی سے خوب نہایا۔

جب میں تولیہ لپیٹے باہر نکلا تو میں نے دیکھا نسرین میرے بستر کی چادر بدل رہی ہے اور آپ ہی آپ اس بلّی کی طرح مسکرا رہی ہے جس نے تھوڑی دیر قبل گھر کا پالتو سفید چوہا کھا ڈالا ہو۔ اس کے چھٹکے ہوئے بھیگے بال اس کی گواہی دیتے تھے کہ وہ بھی ابھی غسل کر کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب نیم شیروانہ، نیم فاتحانہ جھلک تھی، مجھے یقین آگیا کہ رات کی مدہوشی میں میں نے اسے شہزادی کی جگہ دیدی تھی! —— اور مجھے خود اپنے سے نفرت معلوم ہونے لگی۔ میں ڈاکو تھا، بے زبانوں، کمزوروں کی پونجی لوٹ لینے والا ڈاکو! میں نے ایک کنیز پر ہاتھ ڈالا تھا اس لئے نہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی یا میں اس کا دلدادہ و شیدا تھا، بلکہ محض اس لئے کہ اس کا جسم میرے لئے خرید اگیا تھا،

چند سکوں کی عوض اس کی پسند کا حق اس سے چھین لیا گیا تھا۔ باندی ہونے کے بعد وہ اسی طرح استعمال کی جا سکتی تھی جس طرح بستر کی چادر یا تکیہ کا غلاف! —— میرا غصہ یہ سوچکر اور بھڑک اُٹھا کہ یہ حرکت میری بے وفائی کی صاف صاف دلیل تھی۔ میں نے چند گھنٹوں کی جدائی میں شہزادی کی ملکیت پر غیر کو قبضہ کر لینے کا موقع دیدیا۔ میں نے اس قدر جلد ان تمام روایتوں کو بھلا دیا جو وامق و مجنوں، نل اور ہیر نے اپنا سب کچھ کھو کر عشق و عاشقی کے متعلق قائم کی تھیں! میں واقعی طور پر بے مروت، جلد جلد نظر بدلنے والا شہزادہ تھا!

نسرین کو رات کے التفات نے بے تکلف بنا دیا تھا، وہ نظروں میں محبت کا پیام لئے مجھے کپڑے پہنانے بڑھی۔ میں نے اپنے پر آنے والا غصہ اس پر اُتارا۔ اسے ڈھکیل کر جھڑکا "دور ہو جا، یہاں سے!" —— اس نے بوکھلا کر مجھے دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے اپنے ہاں ایک کمزوری سی محسوس کی۔ اسے چھپانے کے لئے زور سے ڈانٹا، "سنتی نہیں ہے بدتمیز! جا یہاں سے!" اور وہ سسکتی ہوئی بھاگ گئی۔ —— اور میں اپنے کو برا بھلا کہتا بستر پر گر پڑا۔

میں ابھی پیچ و تاب کھا ہی رہا تھا کہ بھائی حضور کا حکم ملا "فوراً آؤ۔ سرکار عالیہ یاد فرما رہی ہیں۔" مجھے یقین ہو گیا کہ مخبروں نے سارے واقعات کی خبر انہیں پہنچا دی۔ ورنہ اس طرح طلب کئے جانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جس دن سرکار عالیہ کو شہزادی کے بنجارن ہونے کا علم ہو گیا تھا اسی دن انھوں نے کہلا بھیجا تھا "جب تک یہ ذلیل اور کم ذات عورت تمہارے پاس رہے گی میں تمہاری صورت نہ دیکھوں گی۔" شاید اس دیوانگی عشق کے پہلے ان کا یہ پیغام میرے لئے پیام موت کے

کے برابر ہوتا۔ میں ان سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ وہ بھی اپنی اولاد میں سب سے زیادہ مجھی کو چاہتی تھیں۔ لیکن شہزادی کی محبت نے میرے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا میرے لئے سوائے اس کے دنیا میں کوئی دوسرا نہ رہ گیا تھا۔ نہ میں نے سرکار عالی کی خفگی اور موت سے کوئی اثر لیا تھا اور نہ مجھے چہیتی ماں کی ناراضگی نے متاثر کیا تھا۔ میں نے تو اپنی ساری دنیا شہزادی کے نیچے تج دی تھی!

اس دن جبکہ شہزادی سے محبت نفرت میں بدل رہی تھی میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں واقعی حد درجہ خود غرض، کمینہ خصائل اور رذیل طبیعت ہو گیا ہوں۔ میں نے ایک ذلیل بنجارن کے نیچے باپ کی شفقتوں کو بھلایا اور ماں کی محبتوں پر لات ماری۔ مجھ میں نہ تو خاندان کا لحاظ و پاس باقی رہ گیا ہے اور نہ اس کا احساس کہ ریاست بھر میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہوں گا۔ دنیا مجھے کیا کہتی ہو گی اور میرے اس فعل سے والئ ریاست کی کتنی سبکی ہوتی ہو گی!۔

میں نادم و شرمسار، پریشان و ہراساں سرکار عالیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلام کے لئے جھکا ہی تھا کہ ان کے اشارے پر باندیوں نے صدقہ اتارنا شروع کیا۔ غلہ، کپڑا، چاندی، سونا، نہ جانے کیا کیا مجھ پر سے وارا گیا۔ میں نے اجازت لیکر بیٹھنا چاہا مگر سرکار عالیہ نے ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنی طرف کھینچا، چھاتی سے چمٹایا اور ماتا سے مجبور ہو کر وہ رونے لگیں — میری آنکھوں سے بھی ندامت کے آنسو نکل پڑے۔ میں سرکار عالیہ کی عالی ظرفی کی کیا تعریف کروں وہ میری ماں ہیں، لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عام طریقے کے خلاف، وہ ایک لفظ بھی شکایت یا نصیحت کا زبان پر نہ لائیں، گویا نہ مجھ سے کوئی قصور سرزد ہوا تھا اور

نہ میں نے انھیں کسی قسم کا رنج پہنچایا تھا۔ وہ بار بار میرا چہرہ دیکھتیں اور باغ باغ ہو جاتیں۔ مسرت اور محبت ان کے ہر انداز، ہر لفظ اور ہر حرکت سے ظاہر ہوتی تھی۔ اور میں دل میں کٹتا رہا کہ میں نے ایسی چاہنے والی ماں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا۔ انھیں اس حد کی اذیت پہنچائی۔ ان کے سہاگ چھن جانے کا ایک طرح باعث بنا۔

میں ان کے پاس سے ہٹ کر کے اُٹھا کہ اب شہزادی کا خیال دل سے نکال کر رہوں گا۔ اور اس طرح کی زندگی بسر کروں گا جو ایک والی ریاست کے بھائی اور سرکار عالیہ کے لڑکے کے شایان شان ہے!

ابھی سرکار عالیہ کی ڈیوڑھی سے نکلا ہی تھا کہ اطلاع ملی بھابھی حضور منتظر ہیں۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے خوب خوب لتے لئے۔ ان کو سب سے زیادہ اس کا دُکھ تھا کہ میں نے اپنے لئے کسی ایسی عورت کا انتخاب نہیں کیا جو ان کے ہم پلّہ ہوتی، جس سے وہ بہنوں جیسا سلوک کرتیں۔

میں نے ہنسکر کہہ دیا "یہ تو آپ بزرگوں کا کام ہے۔ آپ نے کیوں اپنی بہن تلاش نہ کی"

وہ خوش ہو کر بولیں "ارے تمھارے مُنہ میں گھی شکر۔ لو آج ہی لو۔ میں سرکار عالیہ کا عندیہ لے لوں، پھر جشکی بجاتے اگر تمھارے لئے چاند سی دلھن نہ لے آئی تو تم کہنا....."

میں تو ہنستا ہوا باہر چلا آیا مگر بھابھی حضور نے اسی دن سے کچھ اس طرح کی جوڑ توڑ لگائی کہ ہمسایہ ریاست کے والی کی صاحبزادی سے (جن کا بقول شاطہ

"ایک گال چاند ایک گال سورج" تھا۔ ایک ہی ہفتہ کے اندر رشتہ طے پا گیا۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ سرکار عالی کا سوگ اُترتے ہی یہ بیچ مچ کی شہزادی میری دلھن بنا دی جائے گی۔

میں نے اس درمیان میں اپنے کو اس درجہ مشغول بنا رکھا تھا کہ مجھے اپنی شہزادی کے متعلق کسی وقت کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ صبح کو میں غسل و ناشتے سے فراغت پاتے ہی فوجی بارکوں میں چلا جاتا، وہاں ایک گھنٹہ تک فوجی ڈرل اور فوجی ساز و سامان کا معائنہ کرتا، پھر مقدمات سنتا، چھوٹی بڑی سزاؤں کے احکام جاری کرتا، بارہ بجے کے قریب واپس آکر کھانا کھاتا پھر لائبریری میں جاکر کچھ مطالعہ کرتا، کچھ تصنیف و تالیف کا کام کرتا۔ پانچ بجے چار پیکر گھوڑے پر سوار ہو کر تفریح کے لئے نکل جاتا۔ اور اسی سلسلے میں فوجی بارکوں کا چکر لگا کر آٹھ بجے رات کو پلٹتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بھائی حضور کے پاس بیٹھتا، اکثر انھیں کے ساتھ کھانا کھاتا اور کبھی کبھی انھیں کے ساتھ نوشی بھی کرتا۔ اگر جلد گھر پلٹ آتا تو نسرین مغنیہ کے فرائض بھی ادا کر لیتا اور ساقی کے بھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ جب تک میں حواس میں رہتا، میں نسرین کو بڑے تنفر کی نظر سے دیکھتا، لیکن جہاں مدہوشی کا آغاز ہوتا جسم کی پکار ہمیشہ دل کی پکار پر غالب آجاتی!

اس طرح ایک سال سے زائد گزر گیا اور وہ دن بھی آگیا جب میں ہمسایہ ریاست میں دولھا بنکر اور نئی دلھن کو رخصت کرا کے گھر لایا۔ جس دن سہ پہر کو ہم پلٹے اسی شب میں دعوت ولیمہ تھی۔ وہ رات بلا کی اندھیاری تھی۔ ہر طرف سے بادل امڈے چلے آرہے تھے کوئی تارہ نظر نہ آتا تھا — وہ گرج اور چمک تھی کہ

ہر جاندار اپنی اپنی جگہ سمٹا ہوا بیٹھا تھا، مگر ہمارے ہاں راج محل میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ پھاٹک پر شہنائی بج رہی تھی، اندر لان پر فوجی بینڈ بج رہا تھا، اور محل میں ڈھول پیٹا جا رہا تھا۔ محل بھر میں بجلی کے رنگین بلب اور جھکر لگاتے ہوئے قمقمے روشن تھے۔ کہیں چمکتے قہقہے "سواگتم" لکھتے، کہیں "خوش آمدید" کہیں "ولکم"۔ ریاست کے امیر اور رئیس زرق برق کپڑوں میں آتے اور بھائی حضور کو مبارکباد دے کر دسترخوان پر بیٹھ جاتے۔ کوئی منچلا کھانے کے پہلے اگر کچھ شغل کرنا چاہتا تو اس کا بھی سامان ایک طرف موجود تھا۔ سب موسم کی طرف سے بے پروا، کیف و سرور کا شکار، اپنے والی کی خوشی میں ہر طرح شریک تھے۔

میں نئے دولھا کی مناسبت سے بھائی حضور کی بغل والی کرسی پہ بیٹھا اپنے دل کی کیفیت پر غور کر رہا تھا، مجھے رنج بھی تھا، مجھے خوشی بھی تھی، مجھے نئی شہزادی سے ملنے کا شوق بھی تھا، مجھے اس کے پاس جاتے ہوئے ایک جھجک سی بھی محسوس ہوتی تھی۔ عجیب طریقہ ہے ہمارے ہاں کا بھی۔ دو زندگیوں کو ایک رشتے میں باندھ دیں گے، اور دونوں میں ایک دوسرے سے کبھی کی ملاقات بھی نہیں۔ نہ اس نے اس کی صورت دیکھی نہ اس نے اس کا چہرہ۔ نہ مزاجوں سے واقف، نہ طبیعتوں سے، نہ اسے معلوم کہ شوہر کو کیا پسند ہے نہ اسے خبر کہ بیوی کو کیا ناپسند ہے۔ بس دو نر و مادہ کبوتر ایک کابک میں بند کر دیے گئے، اور اس زبردستی کی قید پہ یہ اظہار مسرت کہ باجے بج رہے ہیں، دعوتیں ہو رہی ہیں اور ہر شخص خوش خوش مبارکباد دے رہا ہے۔

میں انھیں الجھنوں میں گرفتار، چہرے پر ایک مصنوعی مسکراہٹ کا غلاف

چڑھائے بیٹھا تھا کہ اندر سے حکم آیا دولہا کی طلبی ہے، بھابھی حضور یاد فرما رہی ہیں۔ بھائی حضور کے اشارے پر میں اُٹھا مگر اندر جانے کو دل نہ اٹھتا تھا۔ بھائی حضور نے مسکرا کر ادھر اشارہ کیا جدھر بوتلوں سے کاگ اُڑ رہے تھے۔ میں نے ایک کے بعد ایک تین پیگ پے بہ پے چڑھائے۔ الجھنیں غائب ہو گئیں، سرور و کیف پیدا ہو گیا اور میں کچھ جھومتا، کچھ لڑکھڑاتا اس جگہ پہنچا جہاں بھابھی حضور سہیلیوں کے جھرمٹ میں ایک کمرے کے دروازے پر کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔

وہ مجھے دیکھتے ہی بولیں "کیا آج کی رات بھی اس موئی کے سہارے کی ضرورت تھی؟" —— اور قبل اس کے کہ میں اپنی خجالت مٹانے کے لیے کوئی جواب دوں انھوں نے کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے اندر ڈھکیل دیا اور خود قہقہے بکھرتی دروازہ بھیڑتی چلی گئیں۔

حسنِ ذاتی کو صفت گری و فن کاری جس قدر دلآویز و دیدہ زیب بنا سکتی ہے اس کا نمونہ اطلس و حریر میں لپٹا پھولوں سے ڈھکی مسہری پر ساکت و ساکن پڑا تھا۔ مستی و مدہوشی پیدا کرنے والے بخورات فضا میں عطر بیزی کر رہے تھے۔ کمرے کی ہر چیز قیمتی اور نئی ہونے کی وجہ سے اپنی جگمگاہٹ سے آنکھوں میں خیرگی پیدا کر رہی تھی، اور پھاٹک پر بجتی ہوئی سریلی شہنائی کی ہلکی ہلکی مسحور کن آواز پاؤں کو ایک خاص تال و سم پر اُٹھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نیم وا آنکھیں مسہری پر جمائے، کچھ جھومتا، کچھ لڑکھڑاتا کام و دہن میں ایک خاص طرح کا ذائقہ محسوس کرتا، وارفتگی و سرخوشی کی حالت میں چلا جا رہا تھا، بڑھتا جا رہا تھا، بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔

دفعتہً کمرے کی ساری روشنیاں گل ہوگئیں۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ریشمی دھاگا، وہ طلسمی تار جو مجھے مہری کی جانب کھینچے لئے جا رہا تھا ٹوٹ گیا۔ میں کٹے کنکوے کی طرح ڈگمگانے لگا۔ مجھے خیال آیا شاید اس کمرے کی روشنیاں عمداً گل کر دی گئی ہیں۔ میرا امتحان لیا جا رہا ہے کہ میں اندھیرے میں اپنی منزل اور اپنا مرکزِ کشش ٹٹول کر تلاش کر سکتا ہوں یا نہیں۔ یا کسی شریر ہمدرد نے میری حرکتوں کی پردہ پوشی کی یہ تدبیر نکالی ہے۔ مگر چند لمحے میں سارے محل کے شور و غوغا نے یہ ظاہر کر دیا کہ یہ تاریکی عام ہے۔ ساتھ ہی اس غضب کی چمک اور کڑک ہوئی کہ معلوم ہوا ہمارے سروں ہی پر بجلی گری۔ مہری کی جانب سے ایک چیخ سنائی دی پھر خاموشی۔ میں بتیوں کے گل ہو جانے کا سبب دریافت کرنے پلٹا ہی تھا کہ دلھن کی چیخ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میرے دل نے کہا نئی دلھن گھونگھٹ کی آڑ سے میرا مستانہ وار داخلہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر حیا و شرم کے پردے اور اجنبیت کی چلمن تو پڑی ہی رہی ہوگی۔ اس اچانک تاریکی نے مجھے ایک تاریک سایہ بنا دیا ہوگا۔ یہ چیخ فطری تھی، مگر مجھ سے مدد اور سہارے کی طلب بھی اس میں پوشیدہ تھی اور غالباً مجھے مہری تک رہنمائی کرنے کا ذریعہ بھی بننا چاہتی تھی۔

میں ادھر جھپٹا مگر دو نرم، چھوٹے مگر مضبوط ہاتھوں نے مجھے پکڑ لیا اور میرے کانوں میں دل میں رسی بسی آواز میں کہا گیا "میرے شہزادے!"

میرے پاؤں اس طرح رک گئے جیسے کسی نے انھیں زنجیروں سے باندھ دیا ہو۔ میرا تنفس تیز ہوگیا۔ کمرے کی ساری خوشبوؤں سے الگ، میرے نتھنوں نے وہ بھینی بھینی خوشبو محسوس کی جو صرف ایک حسین ذات کے ساتھ مخصوص تھی۔ میں نے

پھولتے ہوئے دم کو قابو میں کیا اور آہستہ سے پوچھا — "شہزادی ؟"

وہ بولی "ہاں ، باہر چلئے !"

—— اور میں اس کے ساتھ اس طرح باہر چلا آیا جیسے میرے گلے میں رسی پڑی ہو اور اس کا سرا اس کے ہاتھ میں ہو۔ محل میں ہر طرف سراسیمگی تھی، کوئی کہتا تھا "مین فیوز ہو گیا ہے"، کوئی چیختا تھا "شمعیں ڈھونڈ کر لاؤ" کوئی دیا سلائی جلا جلا کر ساتھیوں کو دیکھتا اور چیزیں اٹھاتا۔ کہ پھر تڑاقا ہوا اور پانی اس زور شور سے گرنے لگا جیسے واقعی چادر ابر میں سوراخ ہی نہ کیا گیا ہو بلکہ وہ تار تار کر دیگئی ہو۔ اور پھر لوگوں کے چیخنے کی آوازیں پہلے سے اور بھی تیز ہو گئیں۔

—— اور شہزادی مجھے کشاں کشاں وہاں لائی جہاں اس نے چور دروازے کے قریب بھائی کا مشکی اور میرا نقرہ چھپا رکھا تھا اور ہم پھر گھوڑوں پر بیٹھے اور اسی طوفانی پانی میں گھوڑے بھگاتے نکل گئے۔ جب ہمیں فوری تعاقب کا ڈر نہ رہا تو ہم نے گھوڑوں کی لگام روکی اور میں نے تمکایتوں کا دفتر کھولنا چاہا۔ مگر میرے پہلے ہی سوال کا اس نے ایسا مسکت جواب دیا کہ پھر کچھ پوچھنے کا یارا ہی نہ رہا۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں سر کو جھٹکا دے کر بولی "میں نہیں چاہتی تھی کہ ہمارا معصوم بچہ پہلی سانس کھلی فضا کی جگہ محل کے قفس میں لے !"

اب حرف و حکایت کی کہاں گنجائش؟ اب تو بار بار یہی پوچھتا رہا۔ وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ کب پیدا ہوا؟ اس وقت اس کی دیکھ بھال کون کر رہا

ہے؟" اس حکایت لذیذ کو اس نے لذیذ تر و دراز تر بنا کر بیان کیا۔ اور انسانی زندگی کی اس روز پیش آنے والی کہانی سننے سے میرا جی ہی نہ بھرتا تھا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ اس فسانے میں جلدوں پر جلدیں بڑھتی ہی چلی جائیں۔

وہ رک کر بڑے فلسفیانہ انداز سے بولا "انسان کبھی اپنی نسل کی بقا کا کتنا حریص ہے! اس کی خودی جب تک اولاد کی صورت میں نہ ظاہر ہو اسے چین نہیں ملتا، اس کی تسکین نہیں ہوتی، اسے سچی خوشی نہیں حاصل ہوتی۔ اس کی "انا" اس کی "میں" کی سیری نہیں ہوتی۔ وہ بھول جاتا ہے کہ ستاروں اور سیاروں کے جگمگٹ میں اس کی دنیا کتنی بے مقدار ہے، اور وہ خود اس چھوٹی سی دنیا کا کتنا حقیر اور ذلیل کیڑا ہے۔۔۔"

میں اس فلسفہ طرازی سے گھبرانے لگا۔ اس نے میرے جذبات کا میرے چہرے سے اندازہ لگا لیا اور اس نے کندھے ہلا کر دونوں ہاتھ فرانسیسیوں کی طرح بے بسی ظاہر کرنے کے لئے پھیلائے۔ وہ رک کر بولا۔

"ہم ساری رات اسی بارش اور طوفان میں چلتے رہے۔ کبھی آہستہ، کبھی تیز۔ مگر اس پورے سفر میں مجھے ایک سکنڈ کے لئے بھی نہ تو بھابھی حضور کے غم و غصے کا خیال آیا اور نہ وہ قہر چہرہ پری وش دلھن یاد آئی جو میرے اس طرح اچانک غائب ہو جانے سے مختلف جذبات کا آماجگاہ بنی ہوگی۔ مجھے تو میری کھوئی ہوئی دنیا مل گئی تھی۔ مجھے تو اب کسی شے کی آرزو نہ تھی! بس للک تھی تو یہی کہ کسی طرح یہ سفر تمام ہو اور میں اپنے جگر پارہ کو دیکھ لوں، اپنے روحی انبساط کے باغ کا پہلا ثمر اپنے ہاتھوں میں لیکر اس کی خوشبو سے مشام جاں معطر کر دوں!

صبح کے قریب ہم ریاست کے حدود سے باہر بنجاروں کے ایک "ڈیرے" پر پہنچے۔ وہاں میں نے پہلی دفعہ اپنے نورِ نظر کو شمع جلا کر دیکھا۔ وہ اپنے پالنے میں پڑا سو رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ بھولی صورت میرے دل میں اتر گئی۔ وہ ماں کی ہو بہو تصویر تھا۔ وہی ناک نقشہ وہی صندلی رنگ، وہی غلافی آنکھیں اور سوتے میں لبوں پر وہی ہلکی مسکراہٹ جو میں نے بارہا شہزادی کے چہرے پر دیکھی تھی اور جس نے اکثر راتوں کی نیند مجھ سے چھین لی تھی!۔

ہم دونوں اس پر جھک پڑے۔ کبھی ہم اس دل کے ٹکڑے کو دیکھتے۔ کبھی ایک دوسرے کو۔ شہزادی کی نظر میں غرور تھا۔ فخر تھا، تبختر تھا۔ وہ سب کچھ تھا جو اپنے بہترین شاہکار کو دکھاتے وقت ایک کامل صناع کی نظر میں ہوتا ہے۔ آنکھیں کہتی تھیں، دیکھی تم نے میری تخلیق؟۔ بھلا یہ پھول تمہیں شیش محل میں نصیب ہو سکتا تھا؟ یہ تو ہمارے دل کا نچوڑ ہے کھلی ہوا، آزاد فضا، شبنم و یاسمن، گلاب و سنبل، لالہ و بنفشہ کی آمیزش و خمیر سے بنا ہے۔ محل میں یہ نعمت کہاں؟ میری آنکھیں بار بار ایک دوسرے کا مقابلہ کرتیں۔ اور یہ فیصلہ نہ کر سکتیں کہ ماں بیٹے کے چہروں میں سے دلربائیت کس میں زیادہ ہے۔ بدر ہیں یا ہلال ہیں، گلابِ تازہ ہیں یا غنچہ ناشگفتہ ہیں!

بچہ نے ماں کی خوشبو پائی، سوتے میں کلبلایا، اس کے پنکھڑیوں جیسے لب کھلے اور اس کے منہ سے "اماں" جیسی آواز نکلی اور اس نے ادھر کروٹ لے لی جدھر شہزادی کا چہرہ تھا۔ اور میں نے شہزادی کی وہ چوتھی تصویر دیکھی جو پہلے کی تینوں تصویروں سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سنہری لہر دوڑ گئی،

اس کی آنکھوں میں بجلی سی کوندی، اس کی کنپٹی کی سبز سبز رگیں سمٹیں اور پھیلیں اور اس نے جھک کر بچے کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان دونوں چہروں کے گرد نور کا ایک ہالہ بن گیا ....."

بھکاری نے رُک کر پھر سگریٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے جلدی سے سگریٹ پیش کی۔ وہ دو تین لمبے لمبے کش لگا کر بولا "میں نے بہت دنوں سے کوئی اچھی سگریٹ نہیں پی تھی۔ آج آپ کی شرافت اور نیکی کی وجہ سے یہ نعمت ہاتھ آگئی تو شہزادگی کے دن یاد آگئے!" پھر اس نے ہونٹوں سے سگریٹ ہٹائی اور اسے فرش پر رگڑ رگڑ کر مل ڈالا۔ گویا وہ ماضی کی ساری یادوں کو برباد کر رہا ہے، خاک میں ملا رہا ہے۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا :-

"ہم نے دو برس عجیب طرح کی خوشی میں گزارے۔ کبھی ہم جھونپڑوں میں سوئے، کبھی اپنی چھوٹی سی راؤٹی میں، کبھی ہم نے درختوں کے نیچے بستر جمایا، کبھی ہم نے درختوں کی شاخوں پر بسیرا لیا، مگر ہمارا ہر لمحہ مسرت سے لبریز تھا۔ مجھے ہر وقت یہی محسوس ہوتا کہ میں اسی طرح کی زندگی بسر کر رہا ہوں جو میری فطرت کے بالکل مطابق ہے۔ مجھے کبھی بھی شہزادی کے بنجاروں کے مجمع میں کوئی اجنبیت نہ محسوس ہوئی۔ میں نے کبھی ان کی سادی اور جفاکش زندگی میں کوئی غیریت نہ پائی انھوں نے مجھکو اپنا لیا تھا اور میں نے ان کو۔

جب ریاست کا کوئی جاسوس یا پولیس کا کوئی سپاہی ہمیں ڈھونڈھتا۔ ان کے "ڈیرے" کی طرف آتا تو مجھے بہت پہلے سے اطلاع ہو جاتی۔ اور ہم قریب کے کسی جنگل میں کچھ دنوں کے لئے روپوش ہو جاتے۔ ہمارا جاوید ہمارے ساتھ ہوتا

اور ہم دنیا سے الگ اک نیا گھر بناتے اور درندوں کے بیچ میں رہ کر اپنے کو مہذب انسانوں کے مجمع سے زیادہ محفوظ پاتے۔ بس کبھی کبھی مجھے ایک خیال ضرور ستاتا۔ کیا جاوید بھی ہماری ہی جیسی زندگی بسر کرے گا۔ جنگلوں کی، بنجاروں کی، جاہلوں کی زندگی! میں نے تو سب کچھ دیدہ و دانستہ شہزادی کے لئے تج دیا تھا، مگر کیا جاوید کو بھی کوئی شہزادی مل سکے گی؟ کہیں میں اپنی خوشی کے لئے اپنے بچے کے مستقبل سے تو نہیں کھیل رہا ہوں؟۔ تعلیم و تہذیب کے سارے فوائد سے تو اسے ناجائز طور پر محروم نہیں کر رہا ہوں؟۔ ایسے خیالات میرے دل میں کبھی کبھی کانٹے کی طرح کھٹکتے۔ لیکن شہزادی کو بھولے سے بھی ایسا کوئی خیال نہ ستاتا۔ اس نے تو خود ہی اسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اور اپنے بچے کے لئے اس سے بہتر ماحول اس کے ذہن میں ہی نہیں آسکتا تھا۔

لیکن ہمیں ان باتوں کے متعلق سوچنے کا موقع بھی نہ ملتا تھا۔ ہماری روزانہ زندگی ایک نئی زندگی ہوتی تھی، ہم برابر سفر ہی میں رہتے تھے۔ مشکل سے مہینہ پندرہ دن ہم ایک گروہ کے ساتھ ٹھہرتے، پھر آگے بڑھ جاتے۔ ہم ان خانہ بدوشوں کی جس ٹولی میں پہنچ جاتے شہزادی ان کی لڑکی ہوتی اور میں داماد ہر ایک اپنے اپنے انداز سے ہماری آؤ بھگت کرتا اور ہماری مہمانداری، خاطر و تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ ہم نے اُن کے ساتھ ہندوستان کے مختلف حصّوں کی سیر کی۔ ہمالیہ کی سر بفلک چوٹیاں بھی دیکھیں، نیپال اور بھوٹان کے پُرفضا مقامات بھی دیکھے، آسام کے چائے کے باغ بھی دیکھے، جنگلی ہاتھیوں کے پکڑنے اور ان کو سدھانے کے طریقے بھی دیکھے، ناگاؤں کے جھونپڑوں

میں کبھی ٹھہرے اور اوڑیسہ کے جنگلوں میں کبھی۔ ہم دکن میں کبھی پھرے اور راجپوتانہ میں کبھی۔ لیکن ہم شہروں میں نہ جاتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا شہروں میں پولس کی تھانے چوکیاں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے پاس ہمارے حلیے۔ پہلے ایک ریاست کو ہماری گرفتاری کی فکر تھی، اب دو دو ریاستیں ہماری تلاش میں لگی تھیں۔ اس لئے آزادی کی زندگی دیہاتوں میں تھی، پہاڑوں میں تھی، جنگلوں میں تھی۔ شہزادی کے ساتھ اب کے میں دولھا کے لباس میں بھاگا تھا۔ اس میں جواہرات اتنے ٹکے ہوئے تھے وہ ہماری عمر بھر گذر بسر کرنے کے لئے کافی تھے۔

وہ رک کر کچھ سوچتا رہا۔ اس کی نظریں فضا میں نہ جانے کیا کیا دیکھ رہی تھیں۔ پھر اس نے لمبی سانس لیکر کہا:۔

"ہمالیہ کی وادی میں پہلی بار نمو سے ملاقات ہوئی تھی نمو اپنی ٹولی کا سردار تھا۔ چھ فٹ لمبا، گورا چٹا خاصا وجیہہ۔ سن بھی بچیس سے زاید نہ تھا۔ کالے کالے لمبے بالوں پر اس کی چھوٹی گلابی پگڑی اور اس کے کانوں میں سونے کے موٹے موٹے گول گول چھلے بہت اچھے لگتے تھے۔ مجھ سے ملاقات کے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی مگر آنکھوں میں کچلائی ہوئی آگ بھی تھی۔ اس کا انداز بھی کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اس خلوص اور تپاک کا، جو میرے معاملے میں ہر ایک ظاہر کرتا تھا، نمو کے ہاں صاف صاف اظہار بہت ہی کم تھا۔ وہ بے موقع ہنس پڑتا اور باتیں کرتے کرتے اچانک چپ ہو جاتا۔ اس میں ایک اضطرار تھا۔ ایک بے چینی، سکون کی بالکل کمی۔ مجھے اس کا رویہ دوسروں سے بالکل مختلف محسوس ہوا۔ میں نے تنہائی میں شہزادی سے اس کا ذکر

گیا۔ وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں کچھ خجالت، پشیمانی اور جھینپ سی جھلکی۔ میں نے اصرار سے راز دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ نمو سے اور اس سے بچپن سے رشتہ طے تھا۔ شادی ہونیوالی تھی کہ بیچ میں یہ بھانڈا اور شہزادی نے سارے قبیلے کی رائے اور سیکڑوں برس کی روایت کے خلاف نمو پر مجھ کو ترجیح دیدی اور ایک غیر بنجارہ کی باندی بن گئی۔ میں نے کہا "باندی یا شہزادی؟" مگر پہلی دفعہ میری محبت میں رقابت کا جذبہ بھی شامل ہو گیا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے ناگ پھنی کے انبار میں ڈال دیا ہے۔ یا لال بھڑوں کے چھتے پر رکھ دیا ہے۔ میں اس تکلیف سے بیچین ہو کر راؤنڈ سے باہر نکل گیا۔ اور تیز تیز چلتا ہوا ڈیرے سے میلوں دور نکل گیا۔ میرے دماغ میں بس ایک چرخی سی چل رہی تھی میری شہزادی اور نمو بنجارہ! یعنی میری بیوی میری ناموس پر کوئی دوسرا بھی نظر ہوس ڈال سکتا تھا۔ میں شہزادہ تھا۔ دسیوں پشت سے ہماری بیوپاں محل کی چار دیواری سے نہ نکلی تھیں۔ وہی جو فخریہ کہتی تھیں۔ برہنہ نہ دیکھ تم آفتاب! اور آج ایک بنجارے کی یہ ہمت! مجھے یہ یاد نہ رہا کہ میں خود بھی اب بنجارہ تھا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ شہزادی بنجارن ہے اور اسے میرے ساتھ آفتاب ہی نے نہیں۔ بھائی حضور نے بھی جھیل میں برہنہ غوطہ لگاتے دیکھا تھا۔ میں نے یہ بھی فراموش کر دیا کہ میں نے شہزادی کے ساتھ شادی نہ کی تھی۔ میرے ذہن سے یہ بات بھی نکل گئی کہ شہزادی سے نمو کی صرف منگنی ہوئی تھی، معشوقہ اور محبوبہ بنی وہ میری ہی! دل میں اٹھنے والے اس طوفان کے شور میں نہ تو مجھے اس کا خیال رہا کہ پہاڑ

کے دامن میں تنہا گھوم رہا ہوں۔ اور مجھ پر ہر طرح کے درندے حملہ کر سکتے ہیں۔ نہ اس کا دھیان رہا کہ شام قریب ہے اور راستہ نامعلوم۔ میں ایک چٹان پر چڑھ گیا۔ اور وہاں ٹک لگا کر دل کی الجھنوں میں اس طرح محو ہو گیا کہ نہ میں نے منظر کی دل فریبی دیکھی اور نہ یہ سوچا کہ میں ڈیرے سے کتنی دور ہوں۔

دفعتہً کہیں دور پر ایک لکڑ بھگا چیخا۔ اس کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا لی اور اس کی بازگشت سے ساری وادی گونج اُٹھی۔ میں نے چونک کر اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ سامنے بہت دور پر ہمالیہ کی برف سے ڈھکی چوٹی پر ڈوبتے آفتاب نے سنہری طمع چڑھا دیا تھا اور بڑے بڑے درختوں کے اونچے سبز سبز سروں پر ایک زرتار گوٹ ٹانک دی تھی۔ نشیب کے گھاس سے ڈھکے میدان ہلکے دھوئیں سے چھپتے چلے جا رہے تھے، اغل بغل کے غار دھندلکے میں روپوش ہونے لگے تھے اور پاس بہتے ہوئے چشمے کا پانی کاہی نظر آنے لگا تھا۔ ہوا مرطوب اور ٹھنڈی تھی۔ منظر دلفریب اور فرحت بخش تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ جیسے ہر چٹان کے پیچھے کوئی دشمن تاک میں بیٹھا ہے اور ہر تاریک گوشے میں کوئی حملہ آور موقع پانے کی امید میں خاموش کھڑا ہے۔ اور میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے جلدی جلدی اِدھر اُدھر دیکھا اور جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کا گھوڑا چڑھا لیا۔ میری سانس تیز چلنے لگی، مجھے پسینہ چھوٹنے لگا اور میں نے جلدی جلدی چٹان سے اترنا شروع کیا۔ میرے پاؤں ابھی زمین تک نہ پہنچے تھے کہ دفعتہً سن سے ایک تیر آیا اور میرے کوٹ کی آستین پھاڑتا ہوا پتھر سے ٹکرا کر گر گیا۔ میں نے اپنے کو

زمین پر گرا دیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ مجھے کوئی نہ دکھائی دیا۔ البتہ سو گز کے فاصلے پر ایک جھاڑی اس طرح ہل رہی تھی جیسے کوئی اس میں چھپا ہے میں نے بے سوچے سمجھے حرکت کرنے والے حصّے کو نشانہ بنا کر دو فیر کر دیئے۔ جھاڑی کا ہلنا بند ہو گیا۔ پھر بھی میں تقریباً پانچ منٹ تک اپنی جگہ پر ساکت پڑا رہا۔ تاریکی سرعت سے بڑھتی جاتی تھی۔ ڈیرے تک راستے میں سینکڑوں نشیب و فراز تھے دشمن کمین گاہ میں چھپا بیٹھا تھا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن! ہر منٹ خطرہ بڑھتا جاتا تھا۔ تاریکی میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے جھاڑی پر ایک اور فیر کیا اور جب ادھر سے کوئی جوابی تیر نہ آیا تو لیٹے ہی لیٹے پیٹ کے بل اسی طرف کھسکنا شروع کیا۔ ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا کہ اب جھاڑی کے پیچھے سے کوئی نکلا، اب نکلا، اور میں دوسرے تیر کا نشانہ بنا۔ پھر بھی جی یہی چاہتا کہ حملہ آور کی ایک جھلک ضرور دیکھ لوں۔ اگر کسی کا نشانہ بننا ہی ہے تو میں بھی اس پر وار کرنے کا موقع پالوں۔ اس لئے جب جھاڑی کوئی دس قدم رہ گئی تو میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹیں اور تیزی دوڑ کر جھاڑی پھاند گیا۔ اس طرف کوئی بھی نہ تھا۔ نہ آدمی نہ جانور! ہاں اس سے آگے ایک ٹیلے پر ایک سیاہ سایہ بھاگتا محسوس ہوا۔ اور میں نے فاصلے کا خیال کئے بغیر پھر فیر کیا اور اس کے تعاقب میں دوڑا۔ مجھے یقین تھا کہ حملہ آور بھاگ رہا ہے۔ اسے اس کا موقع نہ ملنا چاہئے کہ وہ حواس درست کر کے پھر کوئی کمین گاہ ڈھونڈھ سکے۔ اسی لئے میں تیزی سے اسی ٹیلے پر چڑھ گیا۔ مگر ٹیلے کی دوسری جانب پھر کوئی نہ دکھائی دیا۔ البتہ راستے میں کئی چھوٹی بڑی چٹانیں تھیں۔ وہ ان میں سے

کسی کے تنے پیچھے چھپ کر دم لے سکتا تھا، پھر حملہ کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے قریب ترین چٹان کی طرف رخ کر کے پھر فیر کیا۔ اور ٹیلے سے اتر کر اسی طرف بڑھا۔ جلدی اور تاریکی میں پاؤں جھوٹا پڑا اور میں منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ چوٹ زیادہ نہ آئی لیکن دم پھولنے لگا اور میں کئی منٹ کی پوری کوشش کے بعد اسے قابو میں لا سکا۔۔۔ ویسے ہی شہزادی کی آواز گونجی "شہزادے! شہزادے!" اور ساتھ ہی تیز دوڑتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے بھی آواز دی "شہزادی، ادھر! یہاں!" اور میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ بعد شہزادی اپنے مشکی پر سوار وہاں آ پہنچی اور مجھ سے لپٹ کر اس طرح سسکنے لگی جیسے اس نے مجھے گم کر کے مدتوں کے بعد پایا ہے، جیسے برسوں کی مایوسی کے بعد اسے امید کی جھلک دکھائی دی ہے۔ میں نے اس کی کمزوری میں کھوئی ہوئی اپنی قوت پا لی، اس کی بدحواسی نے مجھے باحواس بنا دیا۔ میں نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔

"ایں! ایں! یہ آنسو کیسے؟ یہ بے وقت کی برسات کیسی؟"

اس نے کہا "میں ڈر گئی، تم پر کسی نے فیر کئے۔ تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو گیا!"

میں نے کہا "اچھا، اچھا، گھر چلو، پھر بتاؤں گا!" اور ہم دونوں ایک ہی گھوڑے پر سوار ہو کر ڈیرے تک آئے۔ راستے میں شہزادی کے اصرار پر میں نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔ وہ بالکل خاموش رہی۔ مگر جب میں گھوڑے سے اترا تو وہ اس کی پیٹھ پر اسی طرح بیٹھی رہی۔ میں نے سمجھا کہ وہ گھوڑے کو دانے پر لگا کر آئے گی۔ میں اپنی راوٹی میں جا کر جاڑے سے کھیلنے لگا۔ البتہ میرا دماغ بھی اس سے

کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ تیر کس نے مارا۔ نمو کے قافلے والے بنجارے تھے۔ میں ان کا مہمان تھا۔ ان کی یہ حرکت نہیں ہو سکتی۔ یہ ان کی ساری روایت کے خلاف تھا۔ وہ مہمان کے ساتھ دغا نہیں کر سکتے تھے۔ یقینی یہ کوئی نیم وحشی جنگلی تھا یا میری سسرال کا کوئی جاسوس۔ میرے سُسرے نے زندہ و مردہ ہر طرح کی گرفتاری کا میرے لئے انعام مقرر کر دیا تھا۔ ان کی لڑکی کی سب سے بڑی توہین کی گئی تھی وہ مجھے زندہ سے زیادہ مردہ ہی سنا پسند کر سکتے تھے! وہ بیٹی کے بیاہی اچھوتی رہنے پر اس کی بیوگی کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر ان کا جاسوس یہاں آیا کیسے اور اس نے مجھے پہنچانا کیسے؟۔

میں انھیں الجھنوں میں گرفتار تھا کہ دفعتہً خیموں میں ایک شور سا اُٹھا۔ جیسے بہت سے لوگ بیک وقت بڑے جوش سے بحث کر رہے ہیں۔ کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا سارے خیموں کی لالٹینیں ایک دائرے میں لٹکا دی گئی ہیں، بہت بڑا الاؤ سلگا دیا گیا ہے اور سارے بنجارے بیچ میں جمع ہو رہے ہیں ـــــ صدر میں جہاں کچھ بوڑھے بیٹھے تھے شہزادی بھری کھڑی تھی۔ میں ادھر بڑھا دیکھوں کیا بات ہے۔ وہ نمو کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی:۔

"ہاں، ہاں میں نے اس کی جگہ شہزادے کو اپنا سرتاج بنایا!"

میں اپنا نام سنتے ہی ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک درخت کے تنے سے اس طرح ٹیک لگائی کہ مجھ پر آسانی سے نظر نہ پڑے۔ میں سننا چاہتا تھا کہ آج شہزادی اپنے پنچوں کے سامنے کیا مقدمہ پیش کر رہی ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہتا

تھا کہ ان کی نظروں میں شہزادی کی اور میری کیا وقعت ہے، وہ ہم دونوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

شہزادی کا چہرہ سرخ تھا، وہ غصّے سے ہونٹ چبا رہی تھی۔ اس کی بوٹی بوٹی میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں، معلوم ہوتا تھا وہ صاعقہ بنکر کسی نہ کسی پر گرے گی اور اسے خاکستر بنا کر چھوڑے گی۔ وہ کہہ رہی تھی:۔

"آپ ہی سے انصاف چاہتی ہوں، اس نمّو کا اور شہزادے کا کوئی مقابلہ ہے صورت میں، شکل میں، ذات میں، بھانت میں، عزت میں شہرت میں، علم میں ہنر میں، یہ کس چیز میں ان کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ کس بات میں ان کے برابر ہے؟....."

مجمع میں سے ایک غرّایا "ہم خود شہزادے ہیں۔ ہزاروں برس ہم نے اس ملک کی بادشاہت کی ہے!...."

شہزادی اُس پر لپٹ پڑی "رہیں ہوں گے ہم بادشاہ اور شہزادے کبھی! مگر آج تو ہم اُچکے ہیں، چور ہیں، بدمعاش ہیں، دیہاتوں میں جاتے ہیں تو ہم پھلدار درختوں کے نیچے ٹھہرنے نہیں دیے جاتے اور شہروں میں پولس ہماری نگرانی کرتی ہے۔ نہ ہمارے پاس مکان ہیں، نہ ایک بالشت زمین! ہم جیتھڑے لگائے در بدر پھرتے ہیں اور غریب سے غریب آدمی بھی اپنے کو ہم سے اچھا، بہتر اور برتر سمجھتا ہے؟"

ایک نوجوان خفا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا "اگر کوئی ہم کو ذلیل سمجھتا ہے تو وہ خود ذلیل ہے۔ ہم جنگلوں کے بادشاہ ہیں۔ ہم کسی کا دیا نہیں کھاتے، ہم کسی سے بھیک

نہیں مانگتے۔ ہم جڑی بوٹیاں، چاکو چھریاں بیچتے ہیں۔ ہم تاجر ہیں، لٹیرے نہیں!
ہم اپنا خود قانون بناتے ہیں، ہم کسی کے حکم کے پابند نہیں.....!"

ایک بوڑھے نے کھڑے ہو کر ڈانٹا "تم چپ رہو مسّو۔ شہزادی نے ہمارے سامنے مقدمہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتی ہے ہمارے سردار نمو نے ہمارے مہمانداری کے قانون کو توڑا ہے، ہمارے مہمان شہزادے پر تیر چلایا ہے۔ وہ اسے مار ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم کو سوچنا پڑے گا کہ ہم نمو کو کیا سزا دیں....."

نمو کھڑا ہو گیا۔ سب خاموش ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ نصف منٹ تک گردن جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجمع پر نظر ڈالی۔ وہ بولا۔

"شہزادی کا الزام صحیح ہے۔ میں نے شہزادے پر تیر مارا۔ اور مجھے بڑا تعجب ہے کہ وہ کیونکر بچ گیا۔ تم جانتے ہو کہ میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔ کبھی خطا نہیں کرتا۔ خیر! میں تم لوگوں کا سردار ہوں۔ میں تمہارا فیصلہ سننے سے پہلے اپنا فیصلہ سنانا چاہتا ہوں۔ میں شہزادی کے چہیتے سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں، تلوار سے، تیر سے، چاکو سے! جو ہتھیار اس کو پسند ہو اس سے!"

مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ایک شور سا ہوا۔ "کیا کہنا سردار، کیا بات ہے نمو! واہ! واہ! ضرور مقابلہ ہو جائے! ہم بھی تو دیکھیں شہزادی کا شہزادہ کتنے پانی میں ہے! ہم سب کو منظور! منظور! منظور!"

شہزادی بپھری شیرنی کی طرح جھپٹ کر سامنے آ گئی۔ "مجھے ہرگز منظور نہیں۔ وہ بنجارا نہیں ہے، وہ سچ مچ کا شہزادہ ہے، وہ پستول، بندوق، تلوار چلانا جانتا ہے، وہ تیر اور چاکو کیا جانے! تم کو اپنے چاکو چلانے پر بڑا گھمنڈ

ہے تو اس کا مقابلہ میں کروں گی، میں!

ایک نوجوان نے طعن کیا "چھپا لیا نا اپنے شہزادے کو اپنے گھاگھرے میں!"

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں لپک کر مجمع کو چیرتا الاؤ کے پاس پہنچ گیا۔ ہر ایک مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں ساری تعلیم، ساری تہذیب، ساری شہزادگی، سارا اخلاق، سارا رکھ رکھاؤ، سارا فلسفہ بھول گیا تھا۔ میں اس وقت بالکل وحشی تھا، غصے سے دیوانہ مرد! میں نے کہا

"بھائیو! نمو نے مجھ پر چھپ کر چوروں کی طرح حملہ کیا۔ میں اس کا کوئی قصاص نہیں چاہتا، میں نے اسے معاف کیا!....."

اور لوگ تو چپ رہے مگر ایک بوڑھا بول اٹھا "بھئی، بڑے کی بڑی بات!"

میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور کہا "ہاں، مگر نمو نے بھی سب کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کر کے بڑائی دکھائی ہے! اسے نہ بھولو! اسی کے ساتھ نمو نے مجھ سے مقابلے کی خواہش بھی ظاہر کی ہے۔ میں اسے قبول کرتا ہوں۔ جس حربے میں وہ اپنے کو ماہر سمجھتا ہو میں اسی حربے سے اس کے مقابلے کے لئے تیار ہوں!"

شہزادی چیخی "نہیں! نہیں! میں یہ مقابلہ نہ ہونے دوں گی!"

میں نے اسے ڈانٹا "تم چپ رہو! جاؤ، وہاں جا کر بیٹھو جہاں دوسری عورتیں بیٹھی ہیں!"

جب شہزادی گردن جھکائے عورتوں کے مجمع کی طرف چلی تو میں نے نمو سے مڑ کر کہا "کہو دوست، کس حربے سے لڑو گے؟"

وہ مسکرا کر بولا "چاکو سے!۔ اور اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر ایک سگریٹ جلالی۔

شہزادی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ایک بوڑھے نے اُٹھ کر کہا "نہیں! نہیں! شہزادہ چاکو سے لڑنا کیا جانے!"

مسٹو غرّا کر بولا "ہونہہ! شہزادی تو ہماری طرح بنجارن ہے۔ وہ اسے جیتنا چاہتا ہے، تو اسے ہمارے ہی حربوں سے لڑنا بھی پڑے گا!"

"نہیں! نہیں!" اور "ہاں! ہاں!" کا شور اُٹھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو چپ کیا پھر کہا "میرے دوستو مسٹو نے جو کچھ کہا وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے شہزادی کے لئے اسی ہتھیار سے لڑنا چاہیئے جو آپ کا قومی حربہ ہے!"

میں جانتا تھا کہ نمو چاکو سے لڑنے میں ماہر ہے۔ سارے مجمع کا اندازہ بھی یہی بتاتا تھا کہ ہر ایک کو نمو کی جیت اور میری ہار کا یقین ہے۔ اور شہزادی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے اس طرح سسک رہی تھی جیسے وہ ابھی سے مجھے خون میں نہایا، مردہ دیکھ رہی ہے۔ مگر مجھے کسی قسم کا خوف نہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسا میں آپ سے عرض کر چکا ہوں ہمیں بچپن میں ہر طرح کے حربے کا استعمال سکھایا گیا تھا، لیکن مجھے کشتی ورزش کھیل کود سے زیادہ کتب بینی کا شوق تھا۔ میں نے سوائے پستول کے کسی دوسرے حربے کے استعمال میں کوئی مہارت نہیں حاصل کی تھی۔ پھر بھی اس وقت مجھے یقین تھا کہ مقابلے میں جیتوں گا میں ہی۔ وہ شخص، جو نمو کی طرح چھپ کر وار کرے، وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ نہیں

کر سکتا۔ اس کے دل میں اپنی کمزوری کا ڈر چھپا ہوا ہے، وہ پہلے ہی سے اپنی ہار تسلیم کر چکا ہے، ورنہ سامنے آکر ٹوک کر لڑتا۔

نو پر میری بے پروائی اور نڈری کا اثر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ مُنہ کے ایک گوشے میں سگریٹ دبائے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی پیشانی پر پسینہ جھلک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی زردی دوڑ گئی تھی اور اس کے نتھنے پھیلنے اور سمٹنے لگے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ لاکھ چھپائے مگر اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ غالباً اس کی اس گھبراہٹ نے میری خود اعتمادی کو قوت پہنچائی۔ اس لئے کہ میں نے بھی مزید بے پروائی اور نڈری ظاہر کرنے کے لئے اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لئے۔ جیب میں پڑے ہوئے پستول سے انگلیاں مس ہوئیں۔ معاً خیال آیا کہ نو کی گھبراہٹ اور اس کے ڈر میں کچھ اضافہ کیوں نہ کر دیا جائے پھر خود بینی نے اپنی مہارت کی نمائش پر اکسایا۔ میں نے جیب سے ریوالور نکالا، نو کی طرف مڑ کر کہا "میری پسند کا حربہ تو یہ ہوتا!" اور میں نے فیر کر دیا۔

نو کے مُنہ سے نکلی ہوئی سگریٹ آدھی کٹ کر اُڑ گئی۔ پورا مجمع چیخ اُٹھا اور نو "ارے مار ڈالا!" کہہ کر لڑکھڑا گیا۔ میں نے مسکرا کر کہا "ڈرو نہیں نو! میں نے سگریٹ کو نشانہ بنایا تھا تمھیں نہیں!" اس نے ٹوٹی ہوئی سگریٹ لبوں سے نکال کر دیکھی پھر اسے زمین پر ٹپک دیا۔ اور اس کا داہنا ہاتھ بڑی تیزی سے کمر تک گیا اور اس نے وہیں سے چاقو میری طرف پھینکا۔ میں اپنی حرکت کے ردِ عمل کے لئے تیار تھا۔ میں نے پینترا بدل کر جھکائی دیدی مگر قبل اس کے نو کا چھرا میرے پاس سے گزرے ایک دوسرا چھرا سن سے گزرا، دونوں چھرے فضا میں ٹکرائے اور

دونوں زمین پر گر گئے! میں نے پلٹ کر دیکھا تو شہزادی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے نمو کو غصّے اور نفرت سے کھڑی دیکھ رہی ہے۔ وہ ہلکے ہلکے ہانپ رہی ہے اور اس کے جسم میں اسی انداز کی حرکت ہو رہی ہے جو چین پھیلائے ہوئے حملہ کرنے والی ناگن میں ہوتی ہے۔ اس نے دانت پیس کر نمو سے پوچھا "شہزادے کے منہ میں کہاں سگریٹ تھی کہ تم نے نشانہ لگایا تھا، نمو؟"

مجمع کو ان جلد جلد ہونے والے واقعات نے بولنے اور اظہارِ خیال کا موقع نہ دیا تھا، اب شہزادی کے سوال پر پھر ایک شور اُٹھا شہزادے نے بھی اس پر فیر کیا تھا! شہزادے نے اس پر نہیں۔ اس کی سگریٹ پر فیر کیا تھا!..... وہ اتفاق سے بچ گیا، مار ہی ڈالا تھا شہزادے نے..... شہزادہ اسے مارنا چاہتا تو اب تک اسے چاند ماری کا تختہ بنا چکا ہوتا!..... جھوٹ ہے!..... سچ ہے!"

میں نے خاموشی کے لئے پھر ہاتھ اُٹھایا۔ جب لوگ خاموش ہو گئے تو میں نے شہزادی کو پھر ڈانٹا "میں مردوں کے بیچ میں عورتوں کا پھاندنا، لڑنا، بحث کرنا، تُو تُو میں میں کرنا حد درجہ ناپسند کرتا ہوں۔ میری بیوی باقی رہنا ہے تو میری بیوی کی طرح خاموش بیٹھو!"

شہزادی کا چہرہ تمتما اٹھا مگر وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئی۔ میں نے بنجاروں سے کہا "آپ لوگوں کو میرے نشانہ پر شک ہے..... اچھا تو میرے خیمے سے تین موم بتیاں اُٹھا لائیے میں ابھی آپ کو اپنا نشانہ دکھاتا ہوں"

ایک نوجوان دوڑ کر تین موم بتیاں اُٹھا لایا۔ میں نے نمو کو اس کی جگہ سے ہٹوا کر ایک تپائی پر تینوں بتیاں رکھوائیں اور جلوائیں اور جلانے والے اور

دیکھنے والوں کو زد سے ہٹا کر میں نے اپنی جگہ سے کھڑے کھڑے تین غیر کئے اور تینوں بتیاں ایک کے بعد ایک بجھ گئیں۔ لوگ نشانے کی صفائی کو نہیں سمجھ رہے تھے اس لئے مجھے کہنا پڑا۔

"آپ لوگ جاکر ان بتیوں کو اُٹھا اُٹھا کر دیکھیں۔ وہ موم کی ہونے پر بھی نہ تو ٹوٹی ہوں گی نہ کٹی ہونگی۔ میں نے صرف ان کا فلیتہ کاٹ کاٹ کر انھیں بجھایا ہے!"

شہزادی سب سے پہلے دوڑی۔ اس نے تینوں بتیاں اُٹھا اُٹھا کر ایک ایک کر کے دکھائیں۔ سوائے فلیتہ کے نہ کوئی حصہ ٹوٹا تھا نہ کٹا تھا۔ مجمع واہ واہ کرنے لگا، نمو کے چہرے کی زردی اور بڑھ گئی۔

میں نے کہا "آؤ نمو اب ہمارا تمھارا مقابلہ بنجاروں کے خاص حربے چھرے سے ہو جائے!" اور میں نے کوٹ الگ کر کے قمیص بھی اتار ڈالی۔ صرف شلوار پہنے رہا۔ نمو نے اپنا لمبا کرتا اتارا اور تہمد کھول کر پھینک دی۔ وہ پہلے ہی سے چست جانگیا پہنے تیار تھا۔ دو بوڑھوں نے اپنی اپنی کمر سے دو چھرے نکالے ان کے وزن اور قدوں کا مقابلہ کیا۔ دونوں یکساں تھے۔ ایک چھرا انھوں نے مجھے دیا اور دوسرا نمو کو۔ پوچھا "شرط کیا ہوگی؟"

نمو نے کہا "جو ہار جائے وہ فاتح کا زندگی بھر کے لئے غلام!" وہ رُک گیا۔ غالباً اس کی نظر اس مسکراہٹ پر پڑ گئی جو میرے فیصلہ سننے والے لبوں تھی اور جس کو باوجود کوشش کے میں نہ چھپا سکا تھا۔

وہ سر ہلا کر بولا۔

"بیسویں صدی کے ہندوستان میں یہ مقابلہ، یہ غلام و آقا کا ذکر، یہ چہرے بازی اور ایک شہزادے کا بنجارن کے پیچھے یوں دیوانہ ہونا یہ سب جھوٹ اور غلط معلوم ہوتا ہے مگر یقین رکھئے وادی گنگ و جمن کے اُتری اور پچھمی حصوں میں اس سے بھی عجیب تر باتیں ہوتی ہیں۔ وہاں ایک عورت کے پندرہ سترہ شوہر ہوتے ہیں، وہاں لڑکیاں درختوں کے تنے اور گھر کے کھمبے سے بیاہ دی جاتی ہیں اور وہاں اب بھی خفیہ و علانیہ طور پر بردہ فروشی جاری ہے۔ میرا اور ننو کا مقابلہ محض تخئیل کی پیداوار نہیں حقیقت میں واقع ہونے والا ایک فعل تھا جس کے لئے ہم عمر بھر ایک دوسرے سے شرمندہ رہے اور جس کے داغ اب تک ہمارے جسموں پر موجود ہیں ـــ دیکھیں گے آپ؟....

اور وہ پھٹی قمیص اتارنے چلا۔ میں نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں میں اس کے حرف حرف پر یقین رکھتا ہوں!"

اس نے پھر ایک سگریٹ کا خون کیا اور ٹوٹا ہوا پھر ہاتھ سے مل ڈالا جب جا کر وہ بولا۔

الاؤ میں سوکھی لکڑیاں اور ڈال دی گئیں، لال ٹینوں کی بتیاں اکسا اکسا کر انھیں تیز کر دیا گیا، مردوں نے ہمارے گرد حلقہ کر لیا۔ عورتیں اور بچے الگ کر دیے گئے۔ ننو مردانہ حُسن کا نمونہ تھا۔ اس کے اعضا میں تناسب کے علاوہ ابھری ہوئی مچھلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ اس کی چال میں وہ نرم خطرناکی تھی جو شیروں کا خاندانی ورثہ ہے میں بھی تقریباً اسی کی

قد و قامت کا تھا لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میں اس سے چھوٹا ہوں۔ اور سچ عرض کرتا ہوں میرے دل میں پہلی دفعہ ڈر پیدا ہوگیا۔ میں چھرے کے استعمال سے یوں بھی کم واقف تھا، پھر مشق بھی چھوٹی ہوئی تھی۔ بس اتنی امید تھی کہ میں "جوجتسو" سے واقف ہوں اور مجھے کوئی آسانی سے زخمی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس وقت نمو کا کسرتی جسم، پھرتیلا جسم اور اس کی چھرے کی گرفت دیکھ کر مجھے اس مقابلے کے نتیجہ کی طرف سے کھٹکا پیدا ہوگیا۔ ممکن تھا کہ یہ جذبہ بڑھتا اور مجھ پر خوف غالب آجاتا مگر خود نمو نے اسے اضطرار میں تبدیل ہونے سے روک دیا۔ اس نے آگے جھپٹ کر مجھ پر وار کر دیا۔ میں نے پینترا بدل کر اس کا وار خالی دیا۔ وہ لڑکھڑا کر سنبھلا اور ہم دونوں وار کرنے اور بچنے کے لئے پینترا بدلنے لگے۔ میں نے چند ہی منٹ میں محسوس کر لیا کہ نمو جس صفائی سے میرے وار سے بچتا ہے، اور خود جس پھرتی سے وار کرتا ہے یا مجھے جھکائی دیتا ہے وہ بات میرے ہاں نہیں ہے۔ اگر مری آنکھ ذرا بھی جھپکی اور ہاتھ سست چلا تو نمو کا چھرا سینے کے پار ہی ہوگا۔ معاً مجھے استاد کا قول یاد آگیا "دست بدست لڑائی میں دشمن کے جسم کی حرکت نہ دیکھو، صرف آنکھوں کو دیکھتے رہو انھیں کی روشنی میں تم اس کے مقصد کو صاف دیکھ سکو گے"۔ اس لئے میں نمو کے ہاتھوں کی جگہ صرف اس کی آنکھیں دیکھتا تھا اور اس کے ہر وار کو روکنے اور خالی دینے میں کامیاب ہوتا رہا۔ مجھے خود وار کرنے کا اب تک موقع ہی نہ ملا تھا۔ میں برابر اپنے کو بچانے ہی میں لگا رہا تھا۔ لیکن ایک بات میرے لئے باعث مسرت تھی۔ میرا جسم خشک تھا اور میری سانس نہ پھولی تھی۔ ادھر نمو پسینے میں نہا گیا تھا اور وہ

تھکے ہوئے بھینسے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ غالباً نمو نے اس فرق کو محسوس کر لیا
اس لئے کہ وہ ایک وار کرتے ہی پیچھے ہٹا اور بجائے اس کے کہ وہ پینترا بدل کر مجھ پر
دوسرا وار کرے اس نے اچھل کر پوری قوت سے میرے سینے پر لات مار دی
میں زمین پر چت گر پڑا اور وہ اچھل کر میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ اور باوجود
شہزادی اور بوڑھے بنجاروں کی احتجاجی چیخ کے اس نے بھرپور ہاتھ
مارنے کے لئے پوری قوت سے چھرا تانا۔ گرتے وقت میرے ہاتھ سے میرا
چھرا بھی گر پڑا تھا اس لئے سب کو یہی دکھائی دیتا تھا کہ میری جان کی خیر
نہیں۔ لیکن نمو کی طرح سب اس سے بے خبر تھے کہ میں اتنی دیر سے یہی دعا
مانگ رہا تھا کہ کسی طرح نمو کا جسم میرے جسم سے مس ہو جائے اور میرا ہاتھ اسکی
کلائی تک پہنچ جائے۔ نمو نے وہ موقع اپنی حماقت سے خود ہی دیدیا۔ اس کا چھرا
میرے سینے میں پیوست ہونے کے لئے کاٹنے والے سانپ کی تیزی سے چلا اور
میں نے بایاں ہاتھ بڑھا کر نمو کی کلائی پر تھپکی دی۔ چھرا تو چھن سے جا کر دور
گرا اور میں جبٹسو کا پیچ کر کے نمو کی پیٹھ پر تھا اور اس کی دونوں کلائیاں
میرے دونوں ہاتھوں میں تھیں۔

جی تو یہی چاہتا تھا کہ میں نمو کی دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں توڑ دوں اور
اسے ہمیشہ کے لئے لولا کر دوں مگر میں نے غصہ ضبط کیا۔ جاہل تھا، وحشی تھا میری
سب سے بڑی فتح اس کو بے بس کر کے ذلیل کرنے ہی میں تھی۔ میں نے
اس لئے اس کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے کہا "آپ دیکھتے ہیں کہ اس نمو نے دوبارہ
مجھے جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ آخری حملہ بھی اسی نیت سے تھا۔

جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی اس سے بدلہ لے لوں۔ یقین جانئے اک ذرا سی حرکت میں اس کے دونوں موٹے موٹے ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹ کر سرمہ ہو جائیں گی۔ لیکن اس سے میرا کیا فائدہ ہوگا؟ میں کسی کو تکلیف پہنچا کر اپنی خوشی میں کیا اضافہ کر سکتا ہوں۔ پھر میں اپنے کو نو کی سطح پر نہیں لانا چاہتا۔ میں اس لئے پھر جان بخشی کرتا ہوں!"

میں نے اٹھ کر قمیص پہنی، کوٹ کندھے پر ڈالا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے مجمع پر نظر ڈالی۔ لوگ اب تک منہ کھولے حیرت سے نیم بیہوش نوکو، اس کے زمین پر پڑے ہوئے دھڑ کو اور میرے اطمینان سے کھڑے ہوئے اور سگریٹ جلانے کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔

"میں نے سچے دل سے بنجارہ بننے کی کوشش کی، لیکن آپ لوگوں نے بننے نہ دیا۔ شہزادی کو میں نے اپنی سی بنانا چاہا وہ نہ بن سکی۔ میں شہزادہ ہوں، وہ بنجارن! نہ میں ہمیشہ کے لئے اس کا سا بن سکتا ہوں اور نہ وہ بالکل میری پسند کی۔ ایک بار وہ مجھکو چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ آج میں اسے چھوڑ کر جاتا ہوں!"

شہزادی چیخ کر دوڑی میں نے ڈانٹا۔ "خبردار جو ادھر آئیں۔ وہیں کھڑی رہو!" وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اپنے حلق کا کھولتا ہوا زہر اس وقت اس پر انڈیل دیا۔ میں نے کہا "تم محض نام کی شہزادی ہو۔ تم ان بنجاروں کی کچھ ہو میری نہیں! میں نے اپنے کو بہت گرایا۔ اب اس سے زیادہ نیچے گرا تو انسان کی جگہ نمو ہو جاؤں گا!"

اور میں نے جلدی جلدی اپنے نقرے پر زین کسی اور اس پر

بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ شہزادی خوشامدیں کرتی رہی، منجارے منجارنیں روکتی رہیں، خود جاوید کو لوگوں نے اس کی صندلی ٹانگوں پر میری طرف روانہ کر دیا اور وہ "ڈیڈی! ڈیڈی!" کہتا رہا۔ مگر میں نے اس تک کی نہ سنی! شاید کئی پشتوں کے حکمراں بزرگوں کی روحیں اپنے پورے غرور و تمکنت، جبروت و جلال کے ساتھ میرے دل و دماغ پر مسلط تھیں! مجھے رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ میں حد درجہ رسوا ہوا، میری بے انتہا ذلت کی گئی۔ مجھے اس وقت شہزادی سے نفرت تھی، اس کے پیٹ سے پیدا ہونے والے جاوید سے نفرت تھی اور اس پوری زندگی سے نفرت تھی جو میں نے اس کے عشق میں کاٹی تھی۔ اور میری دماغی حالت ایسی تھی کہ اگر کوئی بھی میرا اس وقت پیچھا کرتا تو میں اسے یقینی مار ڈالتا۔

میں ایک ہفتہ رات دن سفر کرتا رہا۔ بس کچھ گھنٹوں کے لئے کسی چشمے کسی دریا کے کنارے کسی کنوئیں کی جگت پر یا کسی سایہ دار درخت کے نیچے سو رہتا یہی آرام کی گھڑیاں تھیں۔ جس میں میرا نقرہ اور میں دونوں سستاتے تھے، ورنہ ہم چلتے ہی رہتے تھے۔ میں نے اس دوران میں کیا کھایا، مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ کچھ خیال آتا ہے کہ دو دن تو صرف جنگلی میووں پر بسر کئے تھے۔ ایک دن ایک تیتر کا پستول سے شکار کیا تھا، اسے آگ پر بھون کر بغیر نمک کے کھایا تھا۔ ایک دن ایک دیہاتی مندر میں کچھ پرشاد بٹ رہا تھا میں نے بھی اسے لیکر کھایا مگر چند کھٹیوں اور بتاشوں میں کیا ہوتا، دانتوں کے لئے خلال کا سامان تھا اس سے کہیں پیٹ بھر سکتا تھا۔ اور یہ پیٹ بھرنے کا سوال ہر وقت بھوت کی طرح سوار رہتا۔ کیا کھاؤں کس کو کھاؤں، کس کو پکڑ دوں، کس کو لوٹوں، کس طرح اس تنور شکم

کو بھروں!

آٹھویں دن میں ریاست کے حدود میں داخل ہوا اور اسی شام کو اپنے محل میں۔ میں نے حمام کیا، کپڑے بدلے اور بھائی حضور کے سلام کو حاضر ہوا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ فرمائیں میں نے دست بستہ عرض کی

"میرا جنونی دورہ ختم ہو گیا۔ میں خود ہی سزا کے لئے حاضر ہوا ہوں!"

ان کی غصّہ بھری نگاہیں محبت بھری نظروں سے بدل گئیں اور انھوں نے مجھے قریب بلا کر سینے سے لگا لیا۔ پھر ہم دونوں اندر آئے۔ سرکار عالیہ کے سامنے بھی پیشی ہوئی اور بھابھی حضور کے ہاں بھی حاضر ہونا پڑا۔ ہر جگہ ڈانٹیں سننا پڑیں، مگر جب خود اپنے گناہوں کا اقرار کر کے ان سے تائب ہونے کا یقین دلاتا تو پھر محبت کرنے والے دل سب رام ہو گئے۔ سب نے معاف کر دیا!....."

اس نے رُک کر پھر میرے سگریٹ کیس کو للچائی نظروں سے دیکھا۔ میں نے جلدی سے سگریٹ پیش کی۔ اس نے حسب معمول ایک سگریٹ جلا کر چند لمبے لمبے کش لئے اور ٹرّا ہاتھ سے مل کر وہیں زمین پر پھینک دیا۔ پھر وہ بولا:۔

"میں نے تقریباً ایک سال اپنی پچھلی زندگی بسر کی۔ اب کے پچھلے معمولات میں دو فرق ہو گئے تھے ایک تو یہ کہ نسرین کی جگہ اس دلھن نے لے لی تھی جو دو برس سے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کا حسن یقینی چاند کو ماند کرتا تھا، لیکن اس کی محبت چاندنی کی طرح ہلکی اور ٹھنڈی بھی تھی۔ اس میں شاہزادی جیسی نہ گرمی تھی، نہ تڑپ تھی اور نہ مدہوشی۔ اس لئے پھر وہی شراب نوشی شروع ہو گئی تھی۔ سرخوشی و بیخودی کے لئے کچھ نہ کچھ تو بہانہ چاہیے ہی تھا۔

دوسری چیز جو شراب و مستی سے بالکل الگ تھی، اس کی ضد تھی، یعنی ورزش، وہ بھی میں نے اپنے روزمرہ میں داخل کر لی۔ ایک فرض کی طرح اپنے پر عاید کر لی تھی۔ میں ڈنڈ پیلتا، مگدر ہلاتا اور تقریباً ایک گھنٹہ روزانہ جیا کو، چھرا، بلم، برچھا اور مختلف حربوں کے استعمال کی مشق میں صرف کرتا۔ میں نے ریاست کے سب سے بڑے بہوئیے کو اسی غرض سے ملازم رکھا تھا کہ وہ مجھے ان تمام ہندوستانی حربوں کے استعمال میں ماہر کر دے۔ اس ورزش کی وجہ سے میری صحت بھی اچھی رہی اور میری نوشی بھی حدود کے اندر ہی رہی۔

غرض زندگی ایک ڈھرّے پر لگ گئی تھی اور ظاہر بیں نظریں اس کا یقین کرنے لگی تھیں کہ میں شہزادی کو بھول چکا ہوں۔ کہ دفعتہً ایک شب میں گیارہ بجے جب میں قلعہ معلیٰ سے اپنے محل پلٹ رہا تھا تو ایک شخص میری موٹر کی روشنی میں دونوں ہاتھ پھیلائے راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور نے بریک لگا کر پوچھا "کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "نمو!"

میں نے اندر کی روشنی جلا کر جلدی سے دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا نمو کے دونوں ہاتھوں میں پٹیاں بندھی ہیں اور اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی ہے۔

میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا بات ہے نمو؟ کیسے آئے؟"

وہ ہانپتا ہوا بولا "سرکار، شہزادی یہاں سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر مر رہی ہے۔ چاہتی ہے آپ کو ایک نظر دیکھ لے"

میں نے نمو کو اندر کھینچ لیا اور ڈرائیور سے کہا "موٹر گھما لو!"

ڈرائیور نے سارا قصہ سن لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا میں نمو کے ساتھ تنہا نہ جاؤں، کچھ سپاہی بھی ہوں، کچھ بندوقیں بھی ہوں، چھوٹی شہزادی کو بھی خبر ہو، بھائی حضور کی بھی اجازت ہو اور سرکار عالیہ کی بھی۔ یہاں صرف ایک چیز دماغ میں تھی۔ شہزادی یہاں سے بیس پچیس میل پر ہے اور اس نے بلایا ہے۔ بس گردن میں پڑا ہوا پھندا کوئی کھینچ رہا تھا اور میں چلنے پر مجبور تھا۔

ڈرائیور نے موٹر گھمانے میں ذرا کم تیزی دکھائی تو میں نے اسے ڈانٹا۔ وہ موٹر تیز لیکر چلا۔ پھاٹک کے قریب میں نے موٹر رکوایا۔ سنتری سے اس کی بندوق اور کارتوس کی پیٹی لی اور پھر ڈرائیور کو تیز سے تیز ہنکانے کا حکم دیدیا۔ جب ہم مضافات شہر سے نکل چکے تو میں نے نمو سے پوچھا "کیا بیمار تھی شہزادی؟"

وہ عجیب طرح ہنسا۔ "بیماری؟ بیماری تو اسے صرف ایک تھی۔ آپ کی محبت!" میں خاموش رہا۔ تو وہ کھسیانی ہنسی ہنسکر بولا "اسے کل بھیڑیئے نے کاٹ لیا ہے، وہ مر رہی ہے!"

میں نے ڈرائیور سے گاڑی اور تیز چلانے کی ہدایت کی۔ اور ہم کچی سڑکوں اور کھیتوں سے ہوتے ہوئے نصف گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے جہاں میری شہزادی پڑی تھی۔

اس کے جسم پر ایک سپید چادر ڈال دی گئی تھی۔ صرف چہرہ کھلا تھا۔ وہی چہرہ جو مصوروں، صناعوں اور شاعروں اور فن کاروں کے جمالیاتی خواب کی تعبیر ہو سکتا تھا۔ آج بھیڑیئے کے پنجے اور ناخون کے زخم سے اس قدر بھیانک

بن گیا تھا کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ ایک آنکھ پھوٹ گئی تھی، ایک گال میں نہ گوشت رہ گیا تھا نہ پوست، جبڑے کی ہڈیاں صاف دکھائی دیتیں۔ نیچے کا ہونٹ تقریباً ندارد تھا۔ گردن کے پاس کا گوشت نُچا ہوا تھا اور جسم کا کوئی حصہ جراحت سے نہ بچا تھا۔ نہ جانے کیونکر وہ اب تک زندہ تھی۔ گھنٹے دو گھنٹے غش میں ڈوبی پڑی رہتی۔ پھر جب آنکھ کھولتی "شہزادہ! شہزادہ!" کی رٹ لگاتی!

میں نے کیونکر اپنے کو پتھر کا بنا کر اس تک پہنچایا اور اس سے باتیں کیں مجھے معلوم نہیں۔ میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ بس اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ میرے جسم میں کوئی لگاتار چھرے مارتا چلا جا رہا تھا اور میرا گوشت کھرچ کھرچ کر ہڈیوں سے الگ کر رہا تھا۔ میں بار بار کانپتا، بار بار مٹھیاں کھولتا اور بند کرتا، بار بار دانت بھینچ لیتا اور شہزادی پر جھکا ہوا اس کی دکھ بھری کہانی سنتا جاتا تھا وہ رُک رُک کر کہہ رہی تھی۔ کس نے اسے یہ سب کہنے کی طاقت دی، کیونکر وہ میرے انتظار میں یہی کہنے کے لئے زندہ رہی آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ......"

اس نے پھر سگریٹ کیس پر چاپا مارا۔ اس نے پھر ٹُھڈّے کو ہاتھوں سے مَسلا اور بولا:۔

"شہزادی نے کہا —— تم آگئے۔ شہزادے! شکر! میں نے تم کو اس دنیا سے اٹھتے سمے بھی دیکھ لیا! میں تمھیں ہر دوسرے تیسرے دیکھنے محل تک جاتی تھی۔ جھاڑی کے پیچھے آدھی آدھی رات تک بیٹھی رہتی تھی تم بھول سکتے تھے اپنی شہزادی کو۔ میں نہیں بھول سکتی تھی اپنے شہزادے کو!.. کل میں

جاوید کو بھی لے جا رہی تھی۔ وہ ڈیڈی! ڈیڈی! کی بہت دنوں سے رٹ لگائے تھا۔ میں نے سوچا اس کا منہ دھلا کر اچھے کپڑے پہنا کر اسے لے چلوں۔ اسی غرض سے باہر والے جنگل میں چشمے پر لے گئی۔ نہ جانے کہاں چھپا تھا یہ بھیڑیا ـــ بس جھاڑی کے پیچھے سے ایک بار جھپٹا، میرے جاوید میرے لعل کو منہ میں دبایا اور اسے لے کر بھاگا۔ میں لپٹ پڑی۔ اس نے خوب کاٹا مگر میں نے بھی اسے نہ چھوڑا۔ تم آ گیا اور اس نے اسے مار ڈالا اور مجھے بچا لیا۔۔ مگر۔ مگر میرا جاوید۔۔۔۔۔" اور وہ ایک بار چیخی" ہائے میرا لعل! کہاں ہے میرا چاند اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

ایک بوڑھی بنجارن نے خون سے تر ایک تھیلا بڑھا دیا۔ اتنا ہی رہ گیا تھا جاوید اس حادثے کے بعد ـــ کچھ تھوڑا سا گوشت، کچھ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں! ـــ مجھے چکر سا آیا۔ بہت سے ہتھوڑے ایک ساتھ سر پر پڑے اور میں وہیں بے جان گر پڑا!

اس نے پھر ایک سگریٹ لی۔ پی اور مسکایا۔ پھر بھی وہ خاموش بیٹھا جھوما کیا وہ کراہ کر بولا۔ "میں اسی دن سے ان دونوں قبروں کی مجاوری کرتا ہوں۔ پانچ پیسے کے ہار چڑھاتا ہوں۔ ایک پیسے کا ہار ننھے جاوید کی قبر پر، ایک آنے کا اپنی شہزادی کی تربت پر۔ مگر ان کی بغل میں ایک اور بھی ہے۔۔۔۔ ہا ہا۔ وہ میرا راز ہے۔ اس کے جاننے کے لئے پانچ پیسے دینگے! لائیے بابوجی آپ کے بادل تو دیا دول دیا!!

اور اس نے اپنے سوکھے ہاتھ میری پنڈلیوں پر رکھ دیئے۔ ایسا محسوس

ہوا جیسے برف میں جھلی ہوئی زنجیر میری پنڈلیوں میں لپٹی جانے لگی اور میں چیخکر جاگا اور میں نے بے ساختہ اپنی ٹانگیں زور سے جھٹک دیں۔

ایک سانپ پلنگ سے ملی ہوئی کھڑکی پر گرا اور تیزی سے نیچے اتر کر کھیت میں بھاگنے لگا۔ میں نے جھپٹ کر بندوق اُٹھائی اور دو فیر کئے مگر میرے ہاتھ اس طرح کانپ رہے تھے کہ نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا اور سانپ ایک کے بتوں میں غائب ہو گیا۔

بنگلے کا چوکیدار دوڑتا ہوا آیا "کیا ہوا بابو جی؟ کیا ہوا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں جی، کمرے میں سانپ تھا۔"

وہ بولا "ارے صاحب، وہی ناگ بابا ہوں گے، جو اس کمرے میں رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں یہاں کسی بابا کی قبر تھی۔ انھیں نے ناگ کا روپ دھارن کیا ہے۔"

وہ تو توہمات کی ایک پوری داستان سنانے کے لئے تیار تھا۔ مگر میں حیات و موت، حقیقت و خواب کے سلسلۂ لاانتہا ہی پر غور کرنے لگا کہ زندگی کا کون سا حصہ خواب ہے، کون سا اس کی تعبیر۔ کون سا حصہ حیات ہے کون سا موت؟ اور ہوس و عشق کی وادی میں کہاں پر ایک کی آخری منزل ہے اور کہاں سے دوسرے کی ابتدائی سرحد! اور ان تمام الجھنوں کے نتیجے میں شاد کا شعر یاد آ گیا ؎

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

مندرجہ ذیل کتب کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے اس لئے جلد ادارہ فروغ اردو لکھنؤ کی شائع کردہ کتابیں خرید فرمائیے

۱۔ مطالعہ حالی — ناظر کاکوروی و شجاعت علی سندیلوی — ۸ے/

۲۔ مطالعہ شبلی — " " — ۸ے/

۳۔ رانکھی ڈرامہ — " " — ۶/

۴۔ ادب کیا ہے (مجموعہ مضامین جدید) — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — عہ/

۵۔ ایک نادر روزنامچہ — " " " — ۸عہ/

۶۔ ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۸ے/

۷۔ اردو کے ہندو ادیب — " " — عہ/

۸۔ سخنہائے گفتنی (جدید تنقیدی مضامین) — پروفیسر کلیم الدین احمد — للعہ/

۹۔ قدر و نظر (مجموعہ مضامین تنقید) — اختر اورینوی — ۸ے/

۱۰۔ نقوش و افکار (جدید تنقیدی مضامین) — مجنوں گورکھپوری — ے/

۱۱۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں — عبدالماجد دریابادی — ے/

۱۲۔ حسرت موہانی (اضافہ شدہ ایڈیشن) — عبدالشکور — ۸عہ/

۱۳۔ ذوق ادب اور شعور (مضامین تنقید) — احتشام حسین — سے/

۱۴۔ ساحل اور سمندر (سفرنامہ امریکہ) — سید احتشام حسین — للعہ/

۱۵۔ روایت اور بغاوت (مجموعہ مضامین) — ۸ے/

۱۶۔ ادب اور نظریہ (مجموعہ مضامین تنقید) — ۸ے/

۱۷۔ نئے اور پرانے چراغ (مع اضافہ جدید) — آل احمد سرور — صہ/

۱۸۔ ذوق جنوں (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) — آل احمد سرور — ۸ے/

۱۹۔ تنقیدی اشارے (مجموعہ مضامین تنقید مع اضافہ جدیدہ) — آل احمد سرور — ے/

۲۰۔ تنقیدی اصول اور نظریے — حامد اللہ افسر — ۸عہ/

کتاب	مصنف	قیمت
۲۱۔ اردو میں تنقید	(ڈاکٹر احسن فاروقی)	[illegible]
۲۲۔ گاندھی جی کے ساتھ یکم جنوری سے ۳۱ دسمبر تک	(حامد اللہ افسر)	[illegible]
۲۳۔ جوئے رواں (مجموعہ جدید کلام)	(حامد اللہ افسر)	[illegible]
۲۴۔ مقدمہ شعر و شاعری	حالی	[illegible]
۲۵۔ ادبی خطوط غالب	(مرزا عسکری)	[illegible]
۲۶۔ طرز اسیر	(امیر احمد علوی)	[illegible]
۲۷۔ فلسفۂ اقبال و انتخاب کلام اقبال	عبدالقوی دریابادی	[illegible]
۲۸۔ بہادر شاہ ظفر مع انتخاب کلام	امیر احمد علوی	[illegible]
۲۹۔ شاہان اودھ	" "	[illegible]
۳۰۔ ہندی کے مسلمان شعراء	(نورانی)	۱۲/
۳۱۔ سرمایہ زبان اردو	(جلال لکھنوی)	[illegible]
۳۲۔ کوشہ گلفروش مزاحیہ مضامین	غلام احمد فرقت	[illegible]
۳۳۔ اپنی موج میں (مزاحیہ مضامین)	آوارہ	[illegible]
۳۴۔ پیسہ اور پرچھائیں (ڈراموں کا مجموعہ)	ڈاکٹر محمد حسن	[illegible]
۳۵۔ ادبی تنقید	" "	
۳۶۔ شرح دیوان اردوئے غالب	طباطبائی	[illegible]
۳۷۔ ثنائے حبیب نعتیہ کلام کا مجموعہ	بہزاد لکھنوی	[illegible]
۳۸۔ اچھی نظمیں	اخگر مشتاق	[illegible]
۳۹۔ قیامت صغرا ناول	خان محبوب طرزی	[illegible]
۴۰۔ دوشیزہ قاف	" "	"
۴۱۔ ایک جان تین قالب	" "	"
۴۲۔ دلربا	" "	"
۴۳۔ سید سالار مسعود غازی	(منشی محمود آبادی)	
۴۴۔ زینب ساحرہ	"	"

مزید کتب کے لیے فہرست طلب فرمائیے

ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد لکھنؤ